# فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۲

## ماہ جنوری ۱۹۷۸ء تا ماہ جون ۱۹۷۸ء

بہ ترتیب حروف تہجی



| | مضمون نگار | صفحہ | | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | پروفیسر ڈاکٹر انور شبنم دل کیلیفورنیا یونیورسٹی، | ۳۹۱ | ۶ | سید شہاب الدین صاحب دسنوی | ۳۰۷ |
| ۲ | جناب جمیلہ شوکت صاحبہ لاہور (پاکستان) | ۴۲۲-۳۶۲ | ۷ | سید صباح الدین عبدالرحمن | ۱۳۶-۶۱<br>۲۱۶-۱۶۳<br>۲۹۳-۲۴۳<br>۳۱۰-۳۰۶<br>۳۴۱-۳۲۲<br>۴۳۴-۴۰۲<br>۴۴۹ |
| ۳ | ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی | ۲۶۴-۲۰۷ | ۸ | ضیاء الدین اصلاحی۔ | ۱۵۷-۷۹<br>۳۶۳-۲۳۸<br>۳۹۷-۳۱۶<br>۴۲۵-۴۰۵ |
| ۴ | مولانا سید سلیمان ندویؒ | ۲۴۵-۱۹۵<br>۳۲۵ | | | |
| ۵ | جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش، | ۱۰۵-۳۲<br>۱۸۹ | ۹ | ڈاکٹر سید عبدالرحیم صدر شعبۂ اردو ناگپور مہاودیالہ (ناگپور) | ۱۵۴ |
| | | | ۱۰ | جناب مولانا عبدالسلام خاں رامپوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور | ۸۵-۵ |

| شمار | مضمون نگار | صفحہ | شمار | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۱ | عبدالسلام قدوائی ندوی | ۲-۸۳ | ۱۴ | منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین | ۴۹-۱۲۱ |
| ۱۲ | مولانا محمد ازہر شاہ قیصر اڈیٹر رسالہ دارالعلوم دیوبند | ۳۰۴ | ۱۵ | جناب صوفی نذیر احمد کاشمیری (دہلی) | ۳۴۱ |
| ۱۳ | مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی | ۲۶۱ | | | |



## شعرا



| شمار | مضمون نگار | صفحہ | شمار | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ڈاکٹر محمد مختار الرحمن خاں مختار صدر شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی - ناگپور | ۳۹۰ | ۳ | ڈاکٹر سلام سندیلوی استاذ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی | ۴۷۴ |
| ۲ | جناب بسمل شاہجہانپوری | ۱۵۶ | ۴ | جناب ماہر القادری کراچی (پاکستان) | ۲۳۵ |
| | | | ۵ | جناب مقیم الدین احسن بابانی مرحوم | ۱۵۶ |
| | | | | پروفیسر معین الدین حسن اجمیر | ۲۳۷ |





# فہرست مضامین معارف

## جلد ۱۲۲

## ماہ جنوری ۱۹۷۸ء تا جون ۱۹۷۸ء

بہ ترتیب حروف تہجی



| شمار | مضمون | صفحہ | شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| | شذرات | ۲-۸۲، ۱۶۲-۲۴۲، ۳۲۲-۴۰۲ | ۸ | سیرۃ النبی جلد ہفتم کا ایک باب | ۱۶۵ |
| | | | ۹ | علامہ اقبال کا فکری ارتقا | ۵-۸۵ |
| | **مقالات** | | | علامہ اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن | ۹۱-۱۳۶، ۲۱۶ |
| | ابن عبد ربہ | ۹۶-۲۲۴ | | | |
| ۲ | امداد خاں واضح کی ایک تصنیف کلمات | ۱۵۲ | ۱۱ | عہد نبوی میں نظام حکومت کے مظاہر و خصائص (سیرۃ جلد ہفتم) | ۲۴۵-۳۲۵ |
| ۳ | استدراک | ۳۰۴ | ۱۲ | لاہور کے علمی تحائف | ۲۹۲-۳۷۱، ۴۳۳ |
| ۴ | اقبال کے مداح اور نقاد | ۳۴۱ | | | |
| ۵ | حافظ سخاوی | ۴۹، ۱۲۱ | ۱۳ | نعت قدسی اور اس کا مصنف | ۲۰۷-۲۷۴ |
| ۶ | حدیث کا تنقیدی مطالعہ | ۲۶۱ | ۱۴ | یہود اور قرآن مجید | ۴۰۵ |
| ۷ | رصدگاہ محمد شاہی دہلی یا جنتر منتر | ۱۰۵-۱۳۲، ۱۸۹ | | | |

جلد ۱۲۲ ماہ محرم الحرام و صفر المظفر ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۸ء عدد ۱

## مضامین

شذرات — عبدالسلام قدوائی ندوی — ۲ - ۴

## مقالات

علامہ اقبال کا فکری ارتقاء — جناب مولانا عبدالسلام خاں رامپوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ (رامپور) — ۵ - ۳۱

رصدگاہ محمد شاہی دہلی یا جنتر منتر — جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل۔ ایل۔ بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش — ۳۲ - ۴۸

حافظ سخاوی — منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین — ۴۹ - ۶۰

علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ۶۱ - ۷۸

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۷۹ - ۸۰

……خ ب ر د ہ……





| شمار | صفحہ | | شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| | **وفیات** | | ۲ | دی ریلیجن آف اسلام | ۳۹۱ |
| ۱ | اعجاز صدیقی مرحوم | ۳۰۷ | ۳ | رسالوں کے اقبال نمبر | ۳۱۳ |
| ۲ | آہ! ڈاکٹر ظفر الہدیٰ | ۳۰۶ | | **ادبیات** | |
| ۳ | آہ! ماہر القادری | ۴۴۹ | ۱ | صبح انسانیت | ۲۳۵ |
| | **آثار علمیہ ادبیہ** | | ۲ | عطائے خاص | ۳۹۰ |
| ۱ | مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی بنام شیخ نذیر حسین صاحب (لاہور پاکستان) | ۳۸۷ | ۳ | غزل | ۱۵۶ - ۴۴۴ |
| | | | ۴ | فخر ہر سیہ او نہال رحمۃ للعالمین | ۲۳۷ |
| | **باب التقریظ والانتقاد** | | | **مطبوعات جدیدہ** | ۷۹ - ۱۷۵، ۲۳۸ - ۳۱۶، ۳۹۷ - ۴۷۵ |
| ۱ | جام شعور | ۳۱۰ | | | |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# شذرات

کاغذ کے سیکڑوں پرزے ہوا کے ایک جھونکے سے تتر بتر ہو جاتے ہیں، اور راکھ کے بڑے بڑے ڈھیر دم کے دم میں بکھر جاتے ہیں، لیکن پتھر کی چھوٹی سی چھوٹی چٹان بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے، اور طوفانی ہوائیں اور آندھیوں کے تیز و تند جھکڑ بھی اسے جنبش نہیں دے پاتے، انسان کا بھی یہی حال ہے، کمزور دل، ضعیف دماغ، کچے ارادہ اور بودے مزاج کے آدمی ہر وقت لرزہ براندام رہتے ہیں، بادِ مخالف کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اُن کو بدحواس کر دیتا ہے، اور نبرد آزما ہونے کے بجائے گریز پائی ہی میں انھیں عافیت نظر آتی ہے، وہ نشانِ منزل کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور مشکلاتِ راہ سے گھبرا کر ہوا کے رُخ پر چلنے لگتے ہیں، کبھی مشرق کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کبھی مغرب کی طرف، اس کی فکر نہیں کہ منزل کدھر ہے، اور کعبۂ مقصود کیا ہے، جانتے ہیں کہ یہ تگ و دو لاحاصل ہے مگر ہمت نہیں ہوتی کہ رُخ صحیح کر لیں،

---

ہندوستانی مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو گیا ہے، تاریخ اُن کی ہمت و جانبازی، دلیری و ثباتِ قدمی، اور اولوالعزمی و حوصلہ مندی کی ولولہ انگیز داستانوں سے لبریز ہے، لیکن عہدِ رفتہ کی شاندار روایات اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں بن چکی ہیں، اب تو نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ ہمارا حال دیکھ کر دورِ ماضی کی تاریخ ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے، اور ہماری نسبت سے اسلاف کی نیک نامی پر دھبہ آتا ہے، عرصہ ہوا جامعہ ملیہ میں مسٹر کیلاٹ تاریخ کے ایک مشہور استاذ تھے،



وہ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر ہم مسلمان طلبہ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کیا تم اُن ہی نامور اسلاف کے اخلاف ہو، جنھوں نے دنیا میں فتح و کامرانی اور عظمت و جلال کے جھنڈے گاڑ دیے تھے، جن کی سیرت کی پختگی، اخلاق کی برتری اور علم و کمال کی بلندی ضرب المثل تھی، جنھوں نے دنیا کو تہذیب و تمدن کا درس دیا، اور جن کی مردانگی و عالی ہمتی نے باطل کی قوتوں کو چور چور کر دیا، جن کے عدل و انصاف نے مظلوموں کی دادرسی کی، جن کے رحم و کرم نے ضعیفوں کی دستگیری کی، اور مصیبت زدوں کی ڈھارس بندھائی، تمھارا جسم نحیف، تمھارا دماغ ضعیف، تمھارا دل کمزور، تمھارے قدم متزلزل، تمھارے حوصلے پست، تمھارے اعمال زشت، تمھارے اخلاق بد، کیا تم انھیں نامور اسلاف کے نام لیوا ہو، جن کی مثال مادرِ گیتی نے نہیں دیکھی،

---

اُن کا تبصرہ سُن کر طبیعت مکدر ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی اُن کی باتوں سے ناگواری بھی ہوتی تھی، وہ حسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ تم ان بزرگانِ عالی کی اولاد ہو، جن کے سمندِ ہمت کے سامنے سمندر پایاب اور پہاڑ تودۂ ریت تھے، جن کی جہانگیری و جہانداری اور جہانبانی و جہان آرائی کی داستانیں اوراقِ روزگار پر ثبت ہیں، اگر تمھارے اندر فلک پیمائی کا حوصلہ باقی نہیں رہ گیا ہے اور تمھارے دلوں میں آفاق گیری کا ولولہ نہیں اُٹھتا تو خدارا کوچہ گردی پر تو نہ اُتر آؤ، اگر دست گیری کی سکت نہیں رہ گئی ہے، تو دست نگری سے تو پرہیز کرو، اگر مظلوموں کی دادرسی کی تاب نہیں ہے تو ظالموں کے پشت پناہ تو نہ بنو، قافلہ سالاری سے عاجز آ گئے ہو تو گردِ کارواں بننے پر قناعت نہ کرو، سمندِ ہمت کو ایڑ لگاؤ، بلند ہمت اسلاف ابھی نگاہوں سے بالکل اوجھل نہیں ہوئے ہیں، اُن کے نقشِ پا کو دلیلِ راہ بناؤ، ملت کے اجزائے پریشان کو مجتمع کرو، اور تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو پھر ایک لڑی میں پرو دو،

---

مسٹر کیلاٹ اس وقت موجود نہیں ہیں، ان کے انتقال کو ایک زمانہ ہو گیا لیکن ان کی یہ تقریر اب تک ذہن و دماغ میں محفوظ ہے، اور آج جب کہ ملت درماندہ راہ تماشائے روزگار اور تصویر عبرت بنی ہوئی ہے، ان کی یہ باتیں بے ساختہ یاد آرہی ہیں، سنتے ہیں کہ کبھی ہم پند بر دیوار سے بھی نصیحت اندوز ہوتے تھے، کیا اس مخلص اور مسلم دوست عیسائی کے الفاظ ہمیں متاثر نہ کریں گے، اس میں شک نہیں کہ حالات بے حد پریشان کن ہیں، راہ پرخار اور منزل دور دراز ہے، لیکن اگر عزم جواں اور ہمت بلند ہو تو یہ ہفت خواں چشم زدن میں طے ہو سکتا ہے،

منزل عشق اگرچہ دور و دراز است ولے ‌‌‌‌‌‌ طے شود ایں جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

—— ⁂ ——

ہمارا خود ایک نصب العین اور ایک مسلک ہونا چاہئے، ماضی کے واقعات اور حال کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کا اندازہ کیا جائے، اور ایسا منصوبہ بنایا جائے جس میں ہمارے قومی مزاج اور ملی روایات کا لحاظ بھی ہو، اور زمانہ کے حالات اور وقت کے مطالبات کی رعایت بھی، یہ نہ ہو کہ ہم ہر صاحب اقتدار کے نقیب بن جائیں اور جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ آجائے اس کی مدح و ثنا کو وظیفۂ حیات بنالیں، اسی طرز عمل سے ہمارا وقار بہت مجروح ہوا ہے، اور ہماری صداقت مشتبہ سمجھی جانے لگی ہے، ۱۹۴۷ء میں ایک ایسے ہی ثناخواں سے سردار پٹیل نے کہا تھا کہ زیادہ نہ کہئے، آدمی ایک رات میں اس قدر بدل نہیں سکتا ہے، پچھلی حکومت کے زمانہ میں بھی تعریف و توصیف کے جواب میں ایک وزیر نے اسی قسم کا تبصرہ کیا تھا، چند جری اور صاف گو صحافیوں نے زبان سے اظہار کر دیا، ورنہ دل میں شاید سب کے یہی بات ہے، ان واقعات سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور خوشامد و چاپلوسی کی پالیسی ترک کر کے وقار و خودداری کی روش اختیار کرنی چاہئے، اور الفاظ میں زور پیدا کرنے کے بجائے سیرت کی پختگی، اخلاق کی برتری، کردار کی بلندی، لیاقت کی فزونی اور صلاحیت کی بہتری سے اپنے وزن میں اضافہ کرنا چاہئے، تاکہ ہماری بات سنی جائے، اور ہماری اہمیت محسوس کی جائے،

—— ⁂ ——



# مقالات

## اقبال کا فکری ارتقاء

از جناب مولانا عبد السلام خان رام پوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور

(۲)

**اقبال یورپ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک**

یورپ کے سہ سالہ قیام میں اقبال کا تعلیمی اور علمی گرد و پیش بالکل بدل گیا تھا، نہ یہاں فرقہ وارانہ نفرت تھی نہ سیاسی کشمکش آزاد اور جمہوری فضا، خاص و عام میں ذمہ داری کا احساس، تعلیم عام، ہندوستان کی بجھی بجھی اور جامد زندگی کے بجائے، مشین کی طرح متحرک اور فعال زندگی، ہر شخص باکار اور مصروف، اپنے کام سے کام، مادی انداز فکر اور مادی اخلاق معیار خوب و زشت یہاں دولت اور سرمایہ کی طاقت تھی، زندگی پر کاروباری پن حاوی تھا، اور رسم و رواج کی حکومت تھی، دیانت داری اور قانون و آئین کا احترام عام تھا، لوگ مہذب اور شائستہ تھے،

اقبال کا یہ تعلیمی قیام ایک طرح سے ہمہ وقتی اور ہر جہتی تحصیل تھی، اساتذہ کے رسمی خطبات تو تھے ہی لیکن تعلیم ان رسمی خطبوں میں محدود نہ تھی، ورزشیں، تفریحیں، چائے اور کھانے کی دعوتیں، نجی صحبتیں اور گھریلو ملاقاتیں، تعلیم کا ضروری حصہ تھیں، فلسفیانہ اور

علمی موضوعات پر بحث و تمحیص، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی مسائل پر قومی اور بین الاقوامی زاویۂ نظر سے گفتگوئیں اور پرلطف، مہذب فقرے بازیاں ان کی خصوصیت تھی، کیمبرج میونخ اور ہائیڈل برگ تو علمی مرکز تھے، ان کا ماحول خاصا علمی تھا، اور تحصیل علم کی خاطر ان میں اقبال کا وقتاً فوقتاً طویل قیام رہتا تھا، کیمبرج میں بین الاقوامی شہرت کے فلسفے کے استاد میکٹیگرٹ، جان سورلے، "پریچنگ آف اسلام" کے مشہور مصنف پروفیسر آرنلڈ میونخ میں مسٹر ران اور ہائیڈل برگ میں مسز ورے گے ناشٹ اور مس سے نے شل سے اقبال نے درس لیا وہ بہت انہماک اور توجہ سے ان سے فائدہ اٹھاتے تھے،

مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے شاگرد نکلسن سے تعلقات عربی و فارسی کے ذوق میں مزید اضافے کا باعث ہوئے، سید علی بلگرامی اور اسلام کی حمایت میں لکھنے والے مشہور مصنف جسٹس امیر علی سے ملاقاتیں اور اسلامی اور ثقافتی مسائل پر گفتگوئیں بھی کم مفید نہ تھیں، اس وقت کے ہندستان کی نہایت صاحب ذوق، تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خاتون عطیہ بیگم سے اقبال کے گہرے روابط کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مختلف اسلامی ممالک کے مشہور اکابر اور فضلار سے، ملک ملک کے طلبہ سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں اور باہم اظہار خیالات کے بھی موقعے ملتے رہے ہونگے، اور ان سب نے اقبال کی شخصیت اور ان کے ذہنی رجحانات پر اثر ڈالا ہوگا اور ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی ہوگی۔

مغربی فلسفہ تو ہندستان سے ہی انکا مضمون تھا، یورپ میں اس کے عمیق مطالعہ کا موقع ملا، اپنے ڈاکٹریٹ کے موضوع "فلسفۂ عجم" کی تقریب سے اسلام کے بنیادی عقائد، مسلم فلاسفہ کے خیالات، مسلم تصوف اور اس کے ماخذ، ہندی فلسفہ



اور قبل از اسلام ایران کے عقائد اور فلسفیانہ افکار سے واقف ہونے اور ان کی تحقیق اور نقد نظر کے مواقع میسر آئے، ماہرین کے مشورے حاصل ہوئے، لندن میں انھوں نے بیرسٹری کے لیے قانون کا مطالعہ کیا، اس ضمن میں اسلامی قانون پر بھی فی الجملہ نظر ڈالنی ضروری تھی[1]

غرض یہ کہ یورپ کے اس سفر سے اقبال نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا، ان کے آئندہ کے مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی خیالات میں ان کے اس تعلیمی سفر کو بہت زیادہ دخل ہے، بین الاسلامی رشتے اور وطنی، قومی تعلق میں فرق کا احساس انھیں اسی سفر میں ہوا، محدود وطنیت کے بجائے ملّیت مغرب کے اسی سفر کی دین ہے[2]، وہاں رہ کر انھیں یورپ کی متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے سمجھنے اسکے عوامل کو جاننے، مختلف پہلوؤں سے اسکو جانچنے اور اس کے قریب و بعید اثرات کو محسوس کرنے کی سہولتیں ملیں، اور انھوں نے ان کو پرکھا، مغربی ممالک کے قومی شعور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر اور محرکات کا مطالعہ کیا، اس کی مادی تہذیب، افادی اخلاق اور سرمایہ دارانہ اقتصاد کا جائزہ لیا، اس کے متوقعہ ثمرات اور نتائج پر غور کیا، وہاں کی رسمیت اور ظاہر داری پر نظر ڈالی، اسلام اور عیسائیت کا مع ان کے مظاہر کے مقابلہ کیا، کچھ کو سراہا، اور قبول کیا، کچھ کو ناپسند کیا اور مسترد کر دیا،

**عشق کی کائناتی اہمیت**

غالباً یہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کا اثر تھا، کہ اقبال پر عشق کی کائناتی عظمت کا انکشاف ہوا، اور انھوں نے اس کو جنسیت سے نکال کر اس کے تقدس کو واضح کیا، حیوانی جذباتیت سے الگ کر کے اس کی تکوینی اہمیت آشکارا کی اور اس کو خلاقِ عالم کا کرم قرار دیا۔

[1] ان تینوں پیراگرافوں کا ماخذ عطیہ بیگم کا "اقبال" ہے ص ۱۵-۲۹ [2] مکتوب اقبال مطبوعہ انوار اقبال ص ۱۷۶

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائے کا ۔۔۔ دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

صورتِ شمع، نور کی ملتی نہیں قبا اُسے ۔۔۔ جسکو خدا نہ دہر میں گریۂ جان گداز دے

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ ۔۔۔ چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

یہ آتشِ عشق اور تپشِ محبت ہے جو حرکت اور عمل کا حقیقی باعث ہے، اکسیر محبت چھڑکنے کے بعد کائنات کا نقشہ :-

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا ۔۔۔ گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے ۔۔۔ چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

کھردری اور ناآہنگ حقیقتوں کی دنیا میں آہنگ پیدا کرنا اور ان کو حسن و جمال دینا عشق کی تخلیقی حرکت کا کرشمہ ہے،

انجام ہے اس خرامِ حسن ۔۔۔ آغاز ہے عشق، انتہا حسن

خوب سے برابر ناآسودگی اور مسلسل خوب تر کی جستجو، حسن و جمال کے ہر اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے سے انحراف اور اعلیٰ تر کی متواتر طلب اسی عہد کی تڑپ اور بے تابی ہے :-

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے ۔۔۔ مضطرب ہوں، دل سکون نا آشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر ۔۔۔ حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز ۔۔۔ سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش ۔۔۔ آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے ۔۔۔ حسن بے پایاں ہے، دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں

اور اس پر دشواری یہ کہ

فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب ۔۔۔ تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں



چنانچہ طلب اور جستجو کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما ۔۔۔ موج بحریم و شکستِ خویش بر دوشیم ما

**عمل اور حرکت** اس زمانے میں یورپ کی فعالیت، حرکت اور غیر معمولی قوتِ عمل سے اقبال خاص طور پر متاثر ہوئے۔ ان پر یہی اثر تھا کہ خود انھوں نے شعر و سخن کی بے عمل اور سکون طلب مصروفیت کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے ۔۔۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

لیکن احباب کی فہمایشوں پھر اپنے محبوب اُستاد مسٹر آرنلڈ کے فیصلے کے سامنے انھیں اپنے اس ارادے سے باز رہنا پڑا، لیکن حرکت و عمل اب انکی شاعری کے خاص موضوع بن گئے، انھوں نے مختلف اسلوبوں سے حرکت، عمل، جد و جہد اور زندگی کے لیے تصادم اور پیکار کی ضرورت پر زور دیا، پہلے ان کے یہاں حرکت و عمل شاعرانہ تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، لیکن اب وہ ان کا پیام اور دعوت تھے :-

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے ۔۔۔ کہتے ہیں جسے سکون نہیں ہے،

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ۔۔۔ یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے ۔۔۔ پوشیدہ قرار میں اجل ہے

حرکت و عمل کے مقابلے میں ہر عظمت کمتر اور حقیر ہے، خواہ وہ زندگی ہی کیوں نہو،

آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکون ۔۔۔ کہتا تھا مورِ ناتوان لطفِ خرام اور ہے

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند نہ تھے، مظاہر پرستی ان کی تربیت کے صوفیانہ پس منظر کے خلاف تھی، یورپ کا حرکت اور عمل میں انہماک اسکے مادی زاویۂ نظر کا مرہون تھا، اس کے پیچھے اس کی کاروباری ذہنیت تھی، لیکن خود مسلم

تاریخ گواہ ہے کہ حرکت و عمل مادیت اور کاروباری انہماک پر موقوف نہیں یہ اقبال کی منطقی تحلیل تھی کہ انھوں نے حرکت و عمل کو گرہ میں باندھا اور اس کی مادیت پسندی اور کاروباری ذہنیت کو بربادی کا پیش خیمہ قرار دیا۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے،
کھرا تم جسے سمجھ رہے ہو وہ اب زرِکم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائدار ہوگا

**آرزوئے نو اور طلب**

ہندوستان کی مبہم تمنا اور بے پردہ حقیقت کی جستجو نے اقبال کا یورپ تک پیچھا کیا۔

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

لیکن یہ اپریل ۱۹۰۶ء کی بات تھی، غالباً فلسفہ، تصوف اور مذہب کے عمیق مطالعہ نے اب ان کے دل میں نئی آرزوؤں اور نئی تمناؤں کو بیدار کر دیا، ان کی جستجو اب کسی عریاں حقیقت کی نہ تھی، اسی عالم آب و گل سے اُن کی طلب متعلق تھی، آرزو اور طلب لازم و ملزوم تھے، آرزو خلاقِ مقاصد تھی اور طلب تحصیل مقاصد، اب اقبال کے سامنے یثرب تھا، یہ نجد کے دشت و بیابان نہ تھے، کہ لیلیٰ اپنے ناقے پر سوار قطع منازل کر رہی ہے، نئی لیلیٰ ہے، اگر تمنا بھی نئی ہو تو قیس اسکے پیچھے کیوں دوڑنے لگا۔

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

طلب اور جد و جہد کا متعین مقصد ہے، یہ مقصد شخصی، قومی اور وطنی نہیں، ملی یا





بین الملی بھی نہیں بلکہ کائناتی اور عالمی مقصد ہے۔ کائنات جس غرض کے لیے خام مال مسالہ تھی، اس غرض کو حاصل کرنا ہے، جہان کو فریضہ ادا کرنا تھا، اب اسکی قضا کا وقت ہے، یہ اس کی نماز ہے، جو ابتک برابر اس کے ذمے چلی آرہی ہے اپنے آپ کو سپرد کر کے اس کی ادائی کر دے۔

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہان کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہوجا

کامیابی اور ناکامی کسی کی قسمت نہیں۔ مال مسالہ موجود ہے، اور صنعت کسی کی اجارہ داری نہیں

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تو بھی آئینہ ساز ہوجا

کسی منزل پر طلب کو نہ ٹھیرنا چاہئے، حاصل سے مطلوب ہمیشہ آگے ہے اور کسی حاصل پر ختم نہیں ہوتا۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہوجا

اس لیے کہ طلب کا ہی دوسرا نام زندگی ہے، طلب ختم ہوئی اور زندگی گئی۔

موت ہے عیش جاوداں، ذوق طلب اگر نہو
گردشِ آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

**ظہور اور نمود کا تقاضا**

ظہور کا تقاضا اور نمود کی خواہش جو ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر حاوی ہوگئی ہے، کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر اکائی ظہور کا تقاضا رکھتی ہے، اور اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے، بحر ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے

آشنا ہے، اور اظہار چاہتا ہے،

لذت گیرِ وجود ہر شے　　سرمستِ مے نمود ہر شے

اقبال کی دعوتِ حرکت و عمل، کی مابعد الطبیعیاتی بنیاد یہی وجود سے لذت گیری اور ظہور و نمود کی یہی اندرونی خواہش ہے، یہ اندرونی تقاضائے ظہور ان کے آئندہ فلسفے میں خاص اہمیت رکھتا ہے،

**تغیر**

شعوری یا غیر شعوری اقبال کے ذہن میں ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات و واردات کی صورت میں جمع ہو رہا تھا، اس میں شاعرانہ توجیہ کے ضمن میں ہی سہی تغیر کا اضافہ اسی عہد میں ہوا ہے، حقیقتِ حسن" میں حسن کو گلہ ہے کہ "جہان میں کیوں نہ مجھے تونے لازوال کیا؟" جواب دیا گیا ہے۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اسکی　　وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جسکی

نمود کے لیے بلکہ دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے، جو چیز حرکت نہیں کر رہی ہے، اس کی کسی فعلیت کا اظہار نہیں ہو رہا ہے، محض امکانات اور استعدادین ہیں، جو کسی حقیقت میں چھپی ہوئی ہیں، بشرطیکہ نمود و ظہور کے عقب میں کوئی جامد اور حقیقت ہو۔ ایسی حالت میں ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں، ہر ظہور کوئی نہ کوئی تغیر ہے، کامل سکون اور مطلق جمود جیسی وجو نہیں عقلی تجرید ہے، وجود استعداد کے عمل میں ظہور کا نام ہے، کسی ہستی کے لازوال ہونے کے معنی نیستی اور کامل خفا ہے، مسلسل بدلتے رہنے کا نام شے ہے، ہر فعلیت اپنے اندر کوئی نہ کوئی استعداد رکھتی ہے، اس استعداد کا ظہور دوسری استعداد رکھتا ہے، اور یوں ہی تغیر جاری رہتا ہے، اس لئے فقط "ثبات تغیر کو ہے زمانے میں"،

**قومیت و وطنیت کے بجائے ملیت**

وطن کے جذباتی ماحول سے علحدگی، مختلف مسلم ممالک کے



باشندوں سے میل جول آپس میں یگانگی کا احساس اور عام وحدتِ خیال، ایرانی مابعد الطبیعیات کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور وطنوں کی شخصیتوں میں تسلسل و تواتر کے ساتھ وحدتِ خیال و عمل اور ساتھ ساتھ تنگ جذبۂ قومیت و وطنیت کے مظاہر اور انکے دور رس اور گہرے نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا ہندوستان میں قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانی مسلمانوں کی اس سے دلچسپی پھر بین الملل وحدت اسلامی تحریک، ان سب کے ملے جلے اثرات نے اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا، ان کے جذبات بدل گئے، مقصد اور نصب العین کی صورت میں وطنیت سے انکا تعلق ختم ہو گیا، وہ ملتِ اسلامی کو معاشرتی وحدت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مستقل سیاسی وحدت بھی ماننے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ وطنی جذبے کی حیثیت محض بیرونی ہے، مسلمان کا حقیقی اور باطنی جذبہ اس کی ملیت ہے،

مستور ہے درونِ جام، پرتو مے بدونِ جام　　اس کا مقام اور ہے اسکا مقام اور ہے
یوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند　　لیکن انھیں خبر نہیں یہ تشنہ کام اور ہے
جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چین سو مصر تک　　ساقی بھی اُسکا اور ہے مے اور جام اور ہے

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، یہ وہ موڑ ہے جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا، اگر وہ ملت کی انفرادیت اور اس کی مستقل وحدت کو مطمحِ نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی الگ شاہراہ نہ بنا پاتی اور وہ دنیا کو سوچنے کے لیے نیا خیال نہ دے سکتے، ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کرتی جس نے ان کو صفِ شعراء میں قابلِ رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا، انکی

شخصیت کی کشش اور محبوبیت ملکت کے اندر اور باہر ان کے اسی فکری انقلاب کی
مرہون ہے۔

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا سمجھنے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مسلم قومیت
خود ایک حقیقت ہے، جو کسی وطن اور کسی قوم سے مخصوص نہیں۔ یہ تاریخ کا انوکھا مظہر
جس کے تحفظ کے طریقے، اس کو موثر اور فعال بنانے کی تدبیریں اور معاشرے میں اس کو
محسوس بنانے کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس نئے سماجی مظہر کا اپنا کوئی وطن نہیں ہے، دنیا تو دنیا، عقبیٰ بھی اس کا وطن اور
نصب العین نہیں، وہ دونوں میں پھیلا ہوا ہے، اس میں دنیا اور آخرت کا کوئی امتیاز
اور آپس میں کوئی حد فاصل نہیں ہے،

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصول حیات ہیں، جن کا شعار اور علامت حرم کی
صورت میں پوری ملت کے لیے جاذب ہے اس کی زعامت اور سربراہی سراپردۂ
یثرب کے سونے والے کے ہاتھ میں ہے۔

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا | اسکا مقام اور ہے اسکا نظام اور ہے
اے بزم دور آخری کس کی تلاش ہے تجھے | تو سجہ حجاز ہے تیرا امام اور ہے

محدود وطنیت اور ملک میں محصور قومیت، افتراق کے بت ہیں، جو ملت کی وحدت



پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان بتوں سے دامن بچانے کی یہی تدبیر ہے کہ
سب ملی وحدت کے شعائر میں جذب ہو جائیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز، اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

"عبد القادر کے نام پیغام" میں اسلامی قومیت کے اصول کے بارے میں جو وطنیت اور قومیت
کے شور و غوغا میں نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں کہتے ہیں اور اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر انکو | تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

اور اس غلط خیال کی جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات خود مسلمانوں کی
ترقی میں حائل ہیں عملی تردید کا سامان کرتے ہیں،

اس چمن کو سبق آئین نمود کا دے کر | قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جان بت کدۂ چین سے اٹھا لیں اپنا | سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیٰ کر دیں

**بے خودی اور خودی** | ممکن ہے فکری طور سے خودی کے اسرار اقبال پر پہلے منکشف ہوئے ہوں،
بے خودی، خودی کا ایسا ضمیمہ ہے، جس سے خودی کے حدود کو مقرر کیا گیا ہے، اور اس کے
تخریبی پہلوؤں کو تعمیر سے ہم آہنگ بنایا گیا ہے، تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک جذباتی
حیثیت سے مقدم ہے جب کہ خودی ابھی تک انکی شخصی انانیت سے آگے نہیں بڑھی ہے اس
زمانے میں ملت سے ان کا شغف، پھر جرمنی کا فلسفیانہ ہیگلی ماحول، کیمبرج میں، ہیگلی فلسفے کے
سب سے بڑے نمائندے میکٹیگرٹ کی شاگردی ان سب کے اثرات تھے کہ اقبال نے فرد کی مستقل
وحدت اور اس کے تقاضوں سے صرف نظر کر لی اور فرد کو اسلامی ملت کے جز ہونے کی
حیثیت سے دیکھا۔

اس زمانے مین ان کے نزدیک فرد کا اپنی انفرادی حیثیت میں متمتع ہونا کوئی معنی نہی
رکھتا، اس کی اپنی الگ انفرادی ہستی نہیں، اس کی انفرادیت محض مجاز اور بے حقیقت
ہے، وہ جو کچھ ہے ملت کا ایک جز ہے، اور یہی اس کا حقیقی وجود ہے، اس کے مفاد کے
معنی ملت کا مفاد ہے، وہ ان ہی فوائد سے متمتع ہو سکتا ہے، جو ملت کے ضمن میں اسے
پہنچ سکیں۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی — فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ مجاز ہو جا

**وحدت وجود** یورپ کے زمانۂ قیام مین بھی اقبال کی شاعری پر وحدت وجود کا سایہ رہا، وجود کی
وحدت کے تصورات اب بھی بظاہر اردو فارسی کے عام شعرار کی تخیلی توحید سے آگے
نہیں بڑھے۔

ہستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ما ستی — بہر نیاز سجدۂ درِ پس ما دو یدۂ
اُفتی اگر بدستِ ما حلقہ بگرد تو کشیم — ہنگامہ گرم کردۂ خود از میان رمیدۂ

یہ کثرت اصل حقیقت کی جلوہ گری ہے، ان مظاہر کے عقب میں ایک ہی وجود ہے
جو قائم و دائم ہے۔

تاسے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہ سحر میں وہ — چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ساتھ ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی نظر میں یہ اعتقاد قابل اعتراض ہے، چنانچہ
ذوق و شوق یا حال سے معذرت کرتے ہیں۔

چمک تیری عیان بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے مین



شریعت کیون گریبان گیر ہو ذوقِ تکلم کی — چھپا جاتا ہون اپنے دل کا مطلب استعارے مین

اب بھی وہ ہستی کے راز کو توحید وجودی سے کھولنا چاہتے ہیں،

راز ہستی راز ہے، جبتک کوئی محرم نہ ہو — کھل گیا جسدم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

اس تصور مین کثرت کے فریبِ نظر ہونے کی ہندی فکر اب بھی شامل ہے۔

جو ایک تھا اے نگاہ تونے ہزار کرکے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

فریب نظر سے رہائی پا چکنے کے بعد وحدت حقیقی کی صورت میں سکون و طمانیت بھی
ہندی فلسفہ ہے۔

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — لا کے دریا میں نہان موتی ہے الا اللہ کا

چشم نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیم عشق — ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

حسی وجود یا جسم کا تمناؤن اور خواہشون کا پیکر محسوس ہونا ہندی تصور ہے،
روح کی وحدت اور وحدتِ حقیقی میں اس کا حلول یا اسی کا ہر شے مین سرایت کئے ہوئے
ہونا ہندستانی وحدت وجود کے تصورات ہیں۔

کمالِ وحدت عیان ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجکو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

حرکت اور تڑپ آبرو نہیں ہے، بلکہ اس سے رہائی پاکر ابدی سکون آبرو ہے،

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری — گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجکو سامان آبرو کا

ابتدائے قیام یورپ کا وحدت وجود کا یہ تصور، شاید برائے شعر گفتن خوب ست کی حدون

تک تھا۔ اس کے پیچھے نہ فکر تھی نہ حال۔ اقبال کے لیے کائنات کی یہ توجیہ عملی صداقت بھی نہ تھی،
اگر ہستی کی حقیقت نفی ہے، اس دعوے کے اور فریب نظر سے رہائی پالینا کمال ہے اور فطرت
سکون وجود ہے تو پھر حرکت و عمل جس کی اس دور میں اقبال نے خاص طور سے دعوت دی
ہے، اس صداقت سے کیسے ہم آہنگ ہو سکتی ہے، یہ حقیقت سے کھلی بغاوت اور فطرت
سے معرکہ آرائی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ اقبال کا عارفانہ تضاد ہے، اور خود انھوں نے
اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ "عاشق ہرجائی" میں اپنے اس تضاد کو تفصیل سے بیان کیا ہے،

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو — رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

اور ان کی یہ گویا ہمیں شغل مے میں سجدہ ریزی سے زیادہ نہیں۔

عین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگ مشرب مینا بھی ہے

**۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی فکر** — اثنائے تحصیل علم میں اقبال عشق کی کائناتی اہمیت اور
حرکت و عمل سے اس کا ربط دریافت کر چکے تھے، مصائب زندگی میں حرکت اور عمل کی اہمیت
ان پر واضح ہو گئی تھی، کائنات میں ظہور اور نمود کا فطری تقاضا انھیں محسوس ہونے لگا
تھا، وہ تغیر اور اس کی تکوینی خاصیت سے واقف تھے، سیاسی اور معاشرتی نصب العین
کی صورت میں ان کا مرکز خیال اب ملت تھی، وہ جانتے تھے کہ ملت کو نصب العین بنا کر انفرادیت
کی قربانی دینا اور بے خودی کو اختیار کرنا ضروری ہے، ان کی فکر کی آیندہ تشکیل کے یہ
سب تار و پود ہیں، گویا ان کی رسمی تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کی منظم فکر کے بہت سے
نقوش کی داغ بیل پڑ گئی تھی، یہ نقوش کہیں گہرے تھے، کہیں ہلکے اور کچھ چیزیں دھندلا
میلا پن تھیں۔ حرکت اور عمل کے ساتھ اس زمانے میں توحیدی تصورات، ان کی وقتی شاعرانہ
تخییل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔



**اقبال پھر اپنے وطن میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک** — اس عہد کے خیالات زیادہ تر پرانے تصورات کا اعادہ ہیں مگر اب
ان میں گہرائی، گیرائی اور وضاحت زیادہ ہے، وحدت وجود
کے عامیانہ تصور کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، رجائیت سے بھرپور حرکت و عمل کی دعوت
ہے، اسلام سے گہرا تعلق اور بانیِ اسلام سے والہانہ شغف ہے، جس کی حدیں کہیں
کہیں تو غیر محتاط خوش اعتقادی سے مل جاتی ہیں، نعت کا مطلع ہے۔[1]

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر — وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

مسلم کرداروں خصوصاً اہل سطوت اسلاف کی اور ان کے تاریخی ورثے اور آثار
کی ثقافتی قدروں اور عظمتوں پر توجہ جامد مقاصد اور بالاتر تمناؤں کی تلقین، اقبال کے
افکار کا یہی محور ہے۔

**وحدت وجود** — شاعرانہ وحدتِ وجود کے بجائے اب کائنات باری تعالیٰ کے صفات
کی جلوہ گری ہے، اس کے اوصاف کا کرشمہ ہے، جو ہر شے سے نمایاں ہے، اس کی طلب
اور جستجو میں کامیاب ہونے کی شرط اس کے آثار قدرت کا مشاہدہ ہے، اس کا روئے
روشن ان ہی آئینوں میں عکس ریز ہے، چاند سے خطاب ہے۔

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی روشنی میں — پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے، سبزے میں سو رہا ہے — بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں
آ! میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا — نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں

اب، وحدت وجود، کے مستند تصور اقبال کے سامنے ہیں، توحید وجودی سے متعلق صوفیاء
کے شطحیات اور ان کے پس منظر پر ان کی نظر ہے۔ "وحدت" عین کثرت نہیں بلکہ کثرت کا

---

۱۔ باقیات اقبال ص ۱۰۷

نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، یہ حال ہے واقفیت نہیں اضطرار ہے، اختیاری عقیدہ نہیں، یہ اپنے مرکز خیال میں گویا ایک طرح کی محویت ہے، اور عشق کی غیر معمولی اور معمولاً وقتی حالت ہے۔

من کہ شمع عشق را در بزم دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم[1]

**وطنیت اور مسلم قومیت** اقبال نے وطنیت، کے سیاسی تصور پر اس زمانے میں سخت نکتہ چینی کی ہے، یہ مادی جدید تہذیب کا تراشا ہوا بت ہے، جس سے انسان کی روحانی وحدت کی جڑ کٹ جاتی ہے،

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بین الاقوامی رقابتوں اور کمزور قوموں کو غلام بنانے کی کوششوں کی بنیاد قومیت اور وطنیت کا یہی محدود تصور ہے،

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو یہ تصور اس کی اُخوت کے لیے سمِّ قاتل ہے۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یوں تو مقامیت کا عام طور سے انجام تباہی ہے۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی

لیکن مسلمانوں کی تو قومیت ہی اس کے مذہب سے وابستہ ہے جو نام ہے مخصوص عقائد،

[1] باقیات اقبال ص ۱۲۲



اعمال اور شعائر و مراسم کا جن سے اُن کی زمانی اور مکانی وحدت اور تسلسل و تواتر قائم ہے، اور اپنی جگہ ایک مستقل ثقافتی اکائی اور وحدت ہیں۔[1] یہ کسی رنگ، نسل اور مقام کا پابند نہیں۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

اس لیے ہر وطن مسلمان کا وطن ہے، مسلمان کہیں کا ہو اس کا وہی وطن ہے، کیونکہ اُس پر کسی وطن کا ٹھپا نہیں۔

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

اگر قومیت کے تصور کو محسوس صورت دینی ضروری ہی ہو، اور اس کے بغیر یہ تصور فعال نہ بن سکے تو پھر اس کی بنیاد ہند و فارس یا شام و مصر نہیں بلکہ مدینہ رسالت اس کا دیس ہے، وہ ملت اسلامی کا مبدا ہے، اور اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دلی لگاؤ ہے،

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

اور اس مسلسل رواں دواں کارواں قومیت کا حقیقی قافلہ سالار نہ کسی مملکت کا سلطان ہے نہ کسی فسطائیت کا قائد یا جمہوریت کا صدرِ اعظم بلکہ میر حجاز اور رسول عربی ہے۔

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

اقبال کے نزدیک قومیت کے تصور کے فعال اور مؤثر ہونے کے لیے "قومیت کا احساس" جس کو بالفاظِ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیے، قومی زندگی کے لیے ضروری ہے، اور جن

[1] ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے، وہ بھی قومی حیات کی ضروریات میں سے ہیں۔[1]

اسلامی قومیت یا ملیت کے متعلق اقبال کا یہ واضح موقف آخر تک قائم رہا، آدمی کو اپنی جنم بھومی سے طبعی لگاؤ ہوتا ہے، اقبال کو نہ اس سے انکار تھا نہ اختلاف، وہ اس کے سیاسی نصب العین بنانے کے اور اس کو ہر طرح کی جدوجہد کا محور قرار دینے کے خلاف تھے اور برابر رہے۔[2]

**مادی تہذیب و ثقافت**

یورپ کے زمانۂ قیام میں ہی اقبال مغربی تہذیب کی خودکشی کی پیشین گوئی کر چکے تھے، جس تہذیب کی بیخ و بنیاد مادی مفاد پرستی پر ہو، وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے، مفادوں کو خاص حدوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا، افراد، طبقات اور اقوام کے مفاد ٹکرائیں گے، اور اس کا انجام خود اس تہذیب کی تباہی ہے، جو ان کے توازن پر قائم ہے،

**اسلامی ثقافت**

اسلامی ثقافت انسان کی روحانی وحدت اور اسلامی اخوت پر مبنی ہے، زمان و مقام کی قیدوں سے آزاد، شخصی، طبقاتی اور نسلی مفادوں سے ناوابستہ۔ اس کا اپنا خاص رہن سہن اور انداز نہیں۔ وہ ایک رخ ہے ایک شعار اور حقیقی فکر ہے، جس کی مسلمان کے شخصی اور جماعتی رہن سہن پر اس کے انداز کردار پر تاثیر ہونی چاہیے، وہ کوئی ہو، کہیں ہو اور کبھی ہو، اگر اس شعار اس رخ اور اس فکر کو چھوڑ دیا! اور مادی تہذیب کی جھوٹی جگمگاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمانہ اس کو روندڈالے گا،

[1] انوار اقبال، تقریظ بر "ہندوستان کی اسلامی تاریخ" ص ۲۰۔ [2] مضامین اقبال ص ۱۸۲۔



فریب تہذیب نو میں آکر جنھوں نے اپنا شعار چھوڑا
جہان کی رہ گذر میں پامال صورت نقش پا رہے ہیں[1]

اگر تہذیب نو کے مرشدوں کے ورغلانے میں آکر مسلمان نے اپنے شعار ترک کر دیئے تو یہ اس کے نصب العین کی شکست ہے،

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
مسافران حرم کو ظالم رہ کلیسا بتا رہے ہیں[2]

اس رخ، شعار اور فکر کے تواتر اور استمرار کو چھوڑ کر یہ ثقافت اپنے حسی وجود میں جامد اور غیر متغیر نہیں، یہ برابر بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہنی چاہیے۔ کوئی شے یکسان برقرار نہیں رہتی۔

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

قومی زندگی میں جمود و ثبات کے معنی موت ہیں، قومی حیات میں یہ امتیاز کہ اس کے کن عناصر کو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیے، اور کن اجزاء کا، قومی حیات کی بقا تواتر اور استمرار کے لیے باقی رہنا ضروری ہے، نہایت سخت مرحلہ ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

مغربی تہذیب اور اسلامی ثقافت کے متعلق اقبال کا آخر تک یہی زاویۂ نظر رہا، وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے افادی انداز کو مسلمانوں کے لیے برابر خطرناک سمجھتے رہے، اور مسلم ثقافت کے بنیادی اور استمراری رخوں کی قدر و قیمت کو انھوں نے

[1] رخت سفر ص ۱۸، ۱۹ [2] ایضاً ص ۱۹

کبھی فراموش نہ کیا، اور ان کو مسلمانوں کا مقدس اثاثہ مان کر ہمیشہ ان کی حفاظت
کی دعوت دی۔

**تغیر**

تغیر کے تصور میں وسعت زیادہ ہو گئی، اور عمق میں اضافہ ہوا، کائنات کی کوئی شے یکساں اور ایک حال پر نہیں رہتی اسکا کوئی رشتہ اور کوئی تعلق دیرپا نہیں ہوتا، ہر وصال فراق کی تمہید اور ہر جدائی قران کی بشارت ہے۔

ہے خواب ثبات آشنائی — آئین جہان کا ہے جدائی

تغیر و انقلاب اشخاص سے ہی خاص نہیں، اقوام و ملل بھی بدلتی رہتی ہیں، ایک قوم فنا ہوتی ہے دوسری نشوونما پا کر پہلی کی جگہ لیتی ہے اور خلا بھر جاتا ہے،

اس زیان خانے میں کوئی ملت گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار

قدامت آشنائی اور پیرپردری زمانے کی عادت نہیں، جدت پسندی اس کی فطرت ہے۔

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوقِ جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نام نو — مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوام نو

ظاہر فعلیت کا خفا اور مخفی صلاحیت کا ظہور اسی کا نام تغیر ہے، قدرت کا یہی کام ہے کہ ظاہر کو معدوم کرے اور مخفی کو وجود بخشے، نہ کوئی عدم فنائے کامل ہے نہ کوئی وجود بقائے محض ہے، ہر عدم وجود کا پیغام ہے، اور ہر وجود عدم کا مقدمہ کلی کی رخصت پھول کی آمد آمد ہے۔

وداع غنچہ مین ہے رازِ آفرینش گل — عدم، عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے!

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے مین — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے مین



شخصی بقا ہستی کا جمود نہیں، تغیرات کا تسلسل اور تواتر ہے، پہاڑ کی بلندیوں سے نہریں آتی ہیں، اور نشیبی وادیوں کی چٹانوں پر گر گر بوندوں میں بدل جاتی ہیں یہی بوندیں آگے بڑھ کر پھر ندیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے

انسان کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، زندگی کا انتشار جمعیت کی طرف بڑھ رہا ہے،

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روان زندگی — گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں بن گئی

پستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم — عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

زندگی کی تالیف اور تالیف کا ضعف و استحکام، موت کے تصادم کی برداشت وغیرہ آئندہ کے افکار ہیں،

**وجود کا تسلسل اور زندگی کی لہریں**

مستقل فکر اور فلسفیانہ تصور کی صورت میں نہ سہی تاہم زندگی کی نہرِ رواں کی وحدت اور استمرار کی طرح خود ہستی اور وجود کے سمندر کا بے پایاں اور ناپید اکنار ہونا اسی زمانے کا خیال ہے، اس بحرِ ہستی مین زندگی کی موجوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ بے اعتبار اور ناپائدار ہیں، شرارے کی چمک یا شعلۂ خس سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں، جذبات سے بھرپور "گورستان شاہی" مین کہتے ہیں۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپید اکنار — اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

اے ہوس! خون رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار

**انسان کی کائناتی قدر و قیمت**

باشعور ہونے اور عرفانِ ذات رکھنے کی وجہ سے انسان کا

مقصد آفرینش ہونا۔ اقبال کا یورپ کے سفر سے پہلے کا تخیل ہے، لیکن اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کی فعالی نوعیت پھر ان کا سرگرم تقاضا ہونا اور اس کے برعکس کائنات کی دوسری چیزوں میں انفعالی استعداد اور انسانی عمل کے اثرات کو قبول کرنے پر آمادگی نیز انسان کے اندر اپنے حلقۂ تاثیر کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی مسلسل حرص اور اپنی حسب خواہش اپنی دانش، بینائی اور توانائی کے بل پر ساری کائنات کو بدل ڈالنے کی صلاحیت یہ اقبال کی نئی اور مستقل فکر ہے، جو ان کے فلسفۂ عمل اور ان کے پیغام سخت کوشی کی جان ہے۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے
اس ذرے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی — یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

انسان محروم عمل نہیں کہ کائنات جیسی ہے؛ اچھی یا بری، اس کو ہی دیکھے جائے وہ اپنے تماشے کے لئے نئی تراش خراش کرنا اور اس اپنی خواہش دید کے مطابق آراستہ کرنا جانتا ہے وہ نرگس کی طرح نہ مجبور ہے نہ صنوبر کی طرح جامد اور قائم، وہ فعال بھی ہے اور لذت آشنائے جد و جہد بھی۔

منظر چمنستان کے زیبا ہو کہ نازیبا — محروم عمل نرگس، مجبور تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے

**مسلمان یا انسان کامل** اقبال کی دعوت کا موضوع انسان کامل یا الہی قوتوں کا مظہر خاص ایسا اعلیٰ انسانی پیکر ہے جو انسانی معاشرے کی پیچیدگیاں سلجھا دے انفرادی اور اجتماعی تضاد کو دفع کرکے بین الملی اور بین الانسانی اخلاق کی بنیادوں کو مستحکم کرے



اقبال کے نزدیک ایسے انسان کامل کا ظہور عملاً کسی ایسے معاشرے میں سے ہی ہو سکتا ہے، جو ایسا مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتا ہو جو انسانیت کے وسیع نصب العین کی سب سے بڑی رکاوٹ، رنگ، نسل اور درجہ بندی کے دشمن ہوں، دنیوی اور کاروباری معاملات میں انکار دیہ ژرف نگاہی اور وسعت قلبی پر مبنی جو اپنے حاملین میں بے نفسی اور ایثار کی پرورش کریں، اور اپنے عملی نمونوں اور ترغیب و دعوت سے اپنے حلقۂ اثر کو برابر بڑھاتے چلے جائیں۔ اس معاشرے میں اگر ایک طرف روشنی ہو تو دوسری طرف گرمی اخلاقی طاقت کی حیثیت میں اسمیں تصادم اور مقابلے کی تاب و توان ہو تو دوسروں کے مصائب اور سختیوں کو محسوس کرنے کے لیے رحمت و رقت۔ اقبال اسلامی معاشرے کو ان خصوصیات کا حامل سمجھتے ہیں، اس لئے قدرتاً انکا پہلا مخاطب یہی معاشرہ ہوتا ہے۔ اسلام اپنی سیدھی سادی تعلیم کے لحاظ سے عقل سلیم کے مطابق بھی ہے اور اس کے باطن میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے نکل سکتا ہے اور کامیابی کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ سکتا ہے[۱]۔

اقبال کی عمر بھر کی دعوت کے مرکز انسان کامل کو باہر نکالنے کی کوشش اور اسلامی معاشرے کی برومندی اور زرخیزی کی تبلیغ اسی عہد سے شروع ہو جاتی ہے، نوید صبح ہی خواب کے ماتے مسلمان کو جگاتے ہیں۔

مسلم خوابیدہ اٹھ! ہنگامہ آرا تو بھی ہو — وہ چمک اٹھا، افق گرم تقاضا تو بھی ہو
وسعت عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب — دامن گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغ سحاب

۱ اقبال کے خط بنام ڈاکٹر نکلسن سے ماخوذ، مطبوعہ مضامین اقبال ص ۶۶-۶۷۔

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز    پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آداب گریز
تو سراپا نور ہے خوش تر ہے عریانی تجھے    اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں، نمایاں ہو کے برق دیدہ خفاش ہو    اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو

اسلام اور اس کے معاشرے کی ندرت اور اس کی پنہاں صلاحیتوں کو نمایاں کرتے ہوئے مسلمان کی غفلت اور بے خبری کو دور کرتے ہیں۔

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے    تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل، کہ تو    قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو    دیکھ تو، پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا    جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت    اے تغافل پیشہ! تجھکو یاد وہ پیماں بھی ہے

عالم کی زیب و زینت اور حسن و جمال مسلمان کی جد و جہد پر موقوف ہے،

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو    لب کشا ہو جا سرود بربطِ عالم ہے تو

**بے خودی اور خودی** | بے خودی کا تصور اب فکری حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ فردِ محض مجاز اور بے حقیقت نہیں رہا بلکہ اب اپنی جگہ معنویت رکھنے لگا ہے، بے خودی اور معاشرہ ہی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شخص اور اُس کی انفرادیت کی گنجائش نکل آئی ہے۔

زندگی کے سمندر میں چھوٹی چھوٹی لہریں اپنا مقام اور مستقل دائرۂ عمل رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے غیر محسوس ربط رکھتی ہیں، اور سمندر سے ان کا تعلق کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے، ان لہروں کی انفرادیت اور شخصیت ان کی ہستی۔ ان کا



انفرادی عمل اور دائرہ عمل سب سمندر کی ہستی پر موقوف اور اس کے اندر محدود ہے۔ سمندر کے باہر نہ لہریں ہیں نہ ان کا عمل اور دائرہ عمل۔ زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا اس کے پاس جو کچھ ہے سمندر کی دین ہے، اس کا مایہ سمندر ہے، چنانچہ فرد نے جو کچھ لیا ہے ملت اور جمعیت سے لیا ہے، جو سیکھا ہے، اس سے سیکھا ہے، اس کا صحیح عمل جو اُس کی زندگی کا تحفظ کر سکے اس کے اثر اور اس کے دائرہ اثر کو وسعت دے سکے ملت کی ہم آہنگی پر موقوف ہے اگرچہ خود ملت کی بقا، اُس کا عمل اور اُس کا ارتقاء بھی افراد سے آزاد نہیں بلکہ افراد پر منحصر ہے۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی    جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں    موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

خودی کا تصور اگرچہ پیدا ہو گیا ہے، لیکن ابھی اس کے نقوش زیادہ گہرے اور اس کی خصوصیات زیادہ واضح نہیں ہوئی ہیں، نہ اس کی فعالی کے حدود اور اُس کی ترقی کے امکانات متعین اور مشخص ہوئے ہیں۔

**جنت اور دوزخ** | اقبال نے اپنی خیالی "سیرِ فلک" میں جنت اور دوزخ کو بھی دیکھا ہے دوزخ کو نار و نور سے تہی اور ہنگاموں سے خالی اور بالکل سرد پایا۔ ان کی غائبانہ تخییل نے انھیں بتایا کہ درحقیقت بذاتِ خود دوزخ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اُس کا سامان تعذیب جو کچھ ہے، مجرم خود اُسے لپیٹ کر آتے ہیں اور اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھتے ہیں۔

دور جنت سے آنکھ نے دیکھا    ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ    اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر    کرۂ زمہریر ہو روپوش

مین نے پوچھی جو کیفیت اسکی — حیرت انگیز تھا جواب سروش

یہ مقام خنک جہنم ہے — نار سے نور سے تہی آغوش

شعلے ہوتے ہیں مستعار اُسکے — جنسے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں — اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

جنت اپنی مستقل ہستی رکھتی ہے، اس کے قصر حورون کے جلوں سے معمور ہے کے چھلکنے اور ساغرون کے کھنکنے کا شور، پینے والون کی نوشا نوش کی صدائیں، طوبی کی شاخون پر طیور کے نغمے غرض یہ کہ۔

کیا سناؤن تمھین ارم کیا ہے — خاتم آرزوے دیدہ و گوش

شاخ طوبی پہ نغمہ ریز طیور — بے حجابانہ حور جلوہ فروش

ساقیان جمیل جام بدست — پینے والون مین شور نوشا نوش

گویا عالم آخرت کی یہ اصلی حقیقت ہے، اب اگر کوئی اپنے بوجھون سے آسنا بوجھل ہوچکا ہو کہ وہان تک پہنچ ہی نہ پائے تو آخرت کی مسرت بخش فضاؤن کا کیا قصور اقبال کی اس خیالی تصویر کو شاعرانہ وجدان کہکر نہ چھوڑا جائے تو ان کی جنت و دوزخ کے متعلق آئندہ فکر کے یہ بہت دھندلے اور دور کے نشان ہین،

**دوش و فردا یا ماضی و مستقبل** اقبال اپنی جگہ بہت زیادہ رجائیت پسند تھے، انھین اپنے نفس گرم پر بھی بھروسا تھا، اور خاکستر ملت میں دبی ہوئی چنگاریون پر بھی اعتماد تھا، ان کی چشم بصیرت ملت اسلامی کی تقدیر دیکھ رہی تھی، اور وہ دکھا رہے تھے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے مین دیکھ — جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے مین دیکھ

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائیگی



شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی

ملت اسلامی کی زبون حالی کے باوجود اس کے معتقدات اور اس کے خطریا عمل کے مٹے مٹے نشانون سے انھیں بڑی توقعات تھیں، وہ ان نشانوں کو گذشتہ روشن فتوحات دکھا کر گہرا اور شورش انگیز بنانا چاہتے تھے، اس امت کا دوش یا ماضی دیکھکر اور دکھا کر اُس کے فردا یا مستقبل کو روشن دیکھ رہے تھے، اور دکھا رہے تھے، ماضی اور مستقبل یا دوش و فردا کی اسوقت تک یہی اہمیت تھی،

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے — میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہون اس دور نشاط افزا کو مین

دیکھتا ہون دوش کے آئینے میں فردا کو مین

زمانے کی خلاق فطرت اور اُس کی فعلیت کا استمرار اور تواتر جوان کے فلسفے کا اہم عنصر ہے، بعد کی فکر ہے (باقی)

---

سلسلۂ دار المصنفین

# غالب مدح و قدح کی روشنی مین

## حصۂ اول

اس میں خود مرزا غالب کی زندگی مین اور اون کی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء تک اُن کی حمایت و مخالفت مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اسکو اجمال کے ساتھ اکٹھا کر کے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، غالبیات کے ذخیرہ میں ایک بہت ہی پر از معلومات و مفید کتاب کا اضافہ۔ اسکا دوسرا حصہ جس مین ۱۹۲۶ء کے بعد اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اوس پر ناقدانہ تبصرہ ہوگا۔ زیر طبع ہے۔ قیمت :- ۔/۱۵

# رصدگاہ محمد شاہی دہلی

## یا

## جنتر منتر

از۔ جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

سوائی راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ جو عوام میں "جنتر منتر" کے نام سے مشہور رہی، اسلامی مشرق کی آخری اور ہندوستان کی غالباً سب سے پہلی رصدگاہ تھی، (اور آخری بھی) اس سے پہلے اس ملک میں کسی رصدگاہ کا پتہ نہیں چلتا، چنانچہ خود راجہ جے سنگھ "زیج محمد شاہی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"و مدت مدید شدہ کہ از راجہ ہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آن نگردیدہ و در فرق اسلام ہم از زمان شاہ شہید مغفور میرزا الغ بیگ تا این زمان کہ زیادہ از سہ صد سال گزشتہ، ہیچ یکے از سلاطین ذی شان و صاحب ثروتان بلند مکان بدین کار متوجہ نشدہ"[1]

بلکہ ایک اطالوی مورخ علم الہیئت جیورجیو ابیٹی کا تو یہ کہنا ہے کہ اس ملک میں کبھی کوئی اور رصدگاہ تعمیر ہی نہیں ہوئی، کیونکہ محکمہ آثار قدیمہ کی انتھک کوششوں کے باوجود (جنتر منتر کے سوا) آج تک کسی رصدگاہ کے کھنڈر نہیں مل سکے،

---

[1] زیج محمد شاہی یونیورسٹی کلکشن مولانا آزاد لائبریری مخطوط ۳۔ زیج فارسیہ علوم ورق ۲ ظ



"Among the ruins of the Sities of Hind-ustan no trace of observatories are found, as in Babylonia" (G. Abetti: the History of Astronomy. P. 21[2]

ویسے اس ملک میں قدیم الایام سے نجوم و جوتش کا چرچا رہا ہے، قدیم ہندوستان میں تو جوتش و دیا، یہاں کے مذہب کا جزء لاینفک تھی، قرون وسطیٰ میں بھی غزنویوں کے زمانہ[3] سے حکومت مغلیہ کے اختتام تک نہ صرف ہندوؤں، بلکہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات میں بھی نجوم اور جوتش کا رواج رہا ہے، (جس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے) علم الہیئت بھی یہاں اعلیٰ نصاب کی تعلیم میں داخل رہا ہے، بالخصوص مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ سے جس کا حکم تھا،

"و حکم شد کہ اہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف انچہ معقول نیست صرف نکنند (دبستان المذاہب ص ۳۲۸)

بایں ہمہ کوئی رصدگاہ قائم نہیں کی گئی، اگرچہ یہاں کے فضلا میں اس کی لیاقت و اہلیت بھی تھی، انھوں نے حکومت کے سامنے اس کے قیام کی تجاویز بھی رکھیں، بلکہ بعض حکمرانوں نے یہ کام شروع بھی کرایا، مگر یہ منصوبہ تکمیل تک نہ پہونچ سکا۔

قیام ازل نے یہ شرف صرف مغل تاجدار محمد شاہ کے دور حکومت کے لیے اور

---

[2] ہندوستان کے شہروں کے کھنڈروں میں بابل کی طرح کسی رصدگاہ کے نشان نہیں ملتے"

[3] نجوم کے ساتھ اعتناء کا قدیم ترین حوالہ غزنوی عہد کے مشہور ہندی المولد شاعر مسعود سعد سلمان کے یہاں ملتا ہے، اگرچہ یہ باور کرنے کی بھی وجوہ ہیں کہ غزنویوں سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان کے شمالی مغربی علاقہ (سندھ و ملتان) میں جہاں اسماعیلی تحریک زور پکڑ رہی تھی، نجوم کا رواج رہا ہوگا۔

اس سے زیادہ جے پور کے فاضل روزگار ادھیراج راجہ جے سنگھ سوائی کی علمی مساعی کیلئے مقدر کر رکھا تھا۔

مگر اس کی تفصیل سے پیشتر اس کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

**رصدگاہ جے سنگھ کا پس منظر**

راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ، رصد خانون کے اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے، جس کا آغاز عباسی خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ) نے کیا تھا، رصدگاہ مامونی سے پہلے کسی ایسی رصدگاہ کا پتہ نہیں چلتا جو حکمران وقت کی سرپرستی میں قائم کی گئی ہو۔

قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے کہ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے اقطار ملک سے علماء ہیئت کو جمع کیا اور بغداد، اور دمشق میں رصدگاہیں قائم کرائیں ان ماہرین علم الہیئت نے آلات رصدیہ میں اصلاح کی اور ان کی مدد سے آفتاب کے "میل کلی" (obliquity of the ecliptic) خروج مرکز (Eccentricity) اور نقطہ اوج" (Apogee) کو متعین کیا۔[۴۹] لیکن ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش تھی۔[۵۰]

مامون کے بعد بھی رصدگاہیں قائم کی جاتی رہیں، چنانچہ ایک ترک محقق نے عہد اسلام میں قائم شدہ صرف ان رصدگاہوں کی تعداد جو سنہ ۹۰۰ء اور سنہ ۱۱۵۰ء کے درمیان تعمیر ہوئیں، اور جن کی دریافتیں ہنوز قابل رسائی مخطوطوں میں محفوظ ہیں ایک سو چار (۱۰۴) بتائی ہے۔[۵۱]

---

۴۹ قاضی صاعد اندلسی۔ طبقات الامم صفحہ ۵۰۔ ۵۰ قانون مسعودی۔ جلد ثانی صفحہ ۵۲۰، کتاب التفہیم شائع کردہ، ریمزرائٹ صفحہ ۱۱۰ کتاب التفہیم فارسی ص ۱۶۰-۱۶۴

۵۱ Cambridge History of Iran vol. V P. 672



ان میں بڑی تعداد ان رصدگاہوں کی تھی، جو ماہرین علم الہیئت نے سرکاری سرپرستی سے آزاد رہ کر محض اپنے ذاتی شوق سے قائم کی تھیں جیسے الکندی، ابوحنیفہ الدینوری، البتانی، ابوریحان البیرونی کی رصدگاہیں۔ مگر ان کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ ذیل میں صرف انھیں رصدگاہوں کا اجمالاً ذکر کیا جا رہا ہے جو سرکاری سرپرستی میں یا حکمران طبقے کے ایماء سے قائم کی گئیں۔

رصدگاہ مامونی کے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر رصدگاہ جو سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئی، بغداد کی رصدگاہ تھی، جسے عضد الدولہ کے بیٹے شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب ہفتگانہ کی سیر و گردش کا مشاہدہ کرنے کیلئے تعمیر کرایا تھا، اس رصدگاہ سے جن ہیئت دانوں کے نام وابستہ ہیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ ابوسہیل ویجن بن رستم کوہی (جو اس رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ تھا) ابوحامد صغانی اور ابوالوفا قابل ذکر ہیں۔[۵۲] یہ لوگ علم ہیئت میں تبحر و تمہر کے علاوہ آلات رصدیہ کی تیاری میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے۔

اگلی قابل ذکر رصدگاہ ابن یونس کی ہے جو مصر کے اسماعیلی خلیفہ العزیز باللہ کے حکم سے تعمیر کی گئی، اور جہاں ابن یونس نے فلکی مشاہدات کئے تھے، ابن یونس کی ارصادی سرگرمیاں العزیز باللہ کے بیٹے الحاکم بامر اللہ (۳۸۶-۴۱۱ھ) کے عہد میں ختم ہوئیں اس نے انھیں جس زیج میں مدون کیا، اسے خلیفہ وقت کے نام پر "الزیج الکبیر الحاکمی" کے عنوان سے معنون کیا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد شیخ بوعلی سینا نے والی اصفہان علاء الدولہ ابن کاکویہ کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصدگاہ ایک جگہ

---

۵۲ ابن القفطی تاریخ الحکماء، ص ۳۵۳۔

دوسری جگہ منتقل ہوتی رہی۔ اس لیے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی،[1]

اگلی صدی میں سلجوقی ترک اسلامی مشرق پر غالب آگئے، انھیں نجوم وہیئت سے دلچسپی نہ تھی۔ مگر خراج کی وصولی کے لیے تقویم (Calendar) کی اصلاح اور نوروز کے تعین کی اشد ضرورت تھی۔ لہذا سلجوقی سلطان ملک شاہ کے حکم سے اصفہان میں رصدگاہ "ملک شاہی" قائم کرائی گئی،[2] جس میں سلطنت کے مشاہیر ہیئت دان جیسے عمر خیام ابوالمظفر اسفزادی، نجیب بن مامون، ابوالعباس لوکری وغیرہم جمع ہوئے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ۴۶۷ھ میں نوروز کا دن ۱۰ رمضان المبارک قرار دیا گیا، اسی کی بنیاد پر اکبر کے دور حکومت میں خراجی سال متعین ہوا،

بین الاقوامی انداز پر سب سے پہلے ارصادی سرگرمیاں مراغہ کی رصدگاہ میں ظہور پذیر ہوئیں، کیونکہ اس کے اندر نہ صرف عراق وخراسان ہی کے ہیئت دانوں نے حصہ لیا۔ بلکہ اندلس (اسپین) مغرب (شمالی افریقہ) اور جیسا کہ نیڈھم (Needham) کا خیال ہے، چینی ماہرین فلکیات نے بھی نمایاں کردار انجام دیا۔ اس رصدگاہ کو ۶۵۷ھ میں ہلاکو خاں نے محقق طوسی کی زیر نگرانی قائم کیا تھا، اس کام کے لیے فضلائے ہندسین وماہرین علم الہیئت جیسے مویدالدین عرضی، نجم الدین کاتبی، فخرالدین مراغی، فخرالدین اخلاطی، محی الدین مغربی، قطب الدین شیرازی بلائے گئے، اور شہر مراغہ کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصدگاہ تعمیر کرائی گئی۔[3] رصدگاہ مراغہ کی فلکیاتی دریافتوں کو "زیج ایلخانی" میں مدون کیا گیا، جو بعد کے ہیئتی حسابات کے لیے نمونہ بنی۔

---

[1] ابن ابی اصیبعہ۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، جلد ثانی ص، [2] ابن الاثیر کامل جلد دہم ص ۳۲ [3] حبیب السیر، جلد سوم جزو اول ۵۹،



۸۲۳ھ میں تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرائی۔[1] تیموری خاندان میں ریاضی وہیئت میں مہارت تامہ کے لئے دو بادشاہ مشہور ہیں، ماوراءالنہر (وسط ایشیا) میں الغ بیگ اور ہندوستان میں ہمایوں، مورخین الغ بیگ کی ریاضیاتی وہیئتی مہارت کے باب میں رطب اللسان ہیں، چنانچہ خواندمیر "حبیب السیر" میں اس کے علم وفضل کے متعلق لکھتا ہے:۔

"مرزا الغ بیگ . . . . . دانش جالینوس باحشمت کیکاوس جمع فرمودہ، ودر سایر فنون خصوصاً علم ریاضی ونجوم دراں زمان عدیل ونظیر نداشت"[2]

اُسے خود بھی ان علوم میں اپنی دستگاہ عالی کا احساس تھا جیسا کہ "زیج جدید سلطانی" کے دیباچہ میں لکھتا ہے،[3] اس پر مستزاد یہ کہ باپ دادا کے جمع کئے ہوئے خزانے اس کے دست تصرف میں تھے، لہذا اس نے رصدگاہ کی تعمیر اور آلات رصدیہ کی تیاری پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا، چنانچہ گستاؤلی بان "تمدن عرب" میں لکھتا ہے:۔

"الغ بیگ کو بھی جو سمرقند کا بادشاہ تھا، اور جس کا زمانہ پندرہویں صدی کا وسط ہے، علم ہیئت کا بے انتہا شوق تھا، اس نے ایسے کامل آلات رصد بنوائے جو اس وقت تک نہیں بنے تھے۔

کہتے ہیں کہ اُس کا ربع دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی سینٹ صوفیہ کی بلندی کے برابر تھا"[4]

رصدگاہ کا انتظام پہلے اس زمانہ کے ایک عظیم ماہر ریاضی وہیئت غیاث الدین

---

[1] احسن التواریخ صفحہ ۱۳۸ [2] حبیب السیر جلد سوم جزو سوم صفحہ ۱۵۱
[3] زیج الغ بیگ ورق ۲ ظ [4] لی بان۔ تمدن عرب ۴۲۲،

جمشید کاشی کے سپرد کیا، ان کی وفات پر اپنے استاد قاضی زادہ رومی (شارح ملخص چغمنی) کو یہ انتظام تفویض کیا، مگر رصد کی تکمیل سے قبل ہی ان کا بھی انتقال ہوگیا لہذا بادشاہ الغ بیگ نے خود بنفس نفیس جہانبانی وحکمرانی کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی توشجی کی مدد سے اس کام کو سرحد تکمیل تک پہونچایا۔[1] اور نئی دریافتوں کو ایک زیج میں مدون کیا جو "زیج جدید سلطانی" یا "زیج الغ بیگ" کہلاتی ہے۔[2]

"زیج الغ بیگ" "زیج ایلخانی" ہی کے انداز پر تصنیف کی گئی۔ موخر الذکر میں چار مقالے ہیں، پہلا مقالہ تواریخ (Calander) پر ہے، دوسرا کواکب کی سیر وگردش پر تیسرا مقالہ اوقات ومطالع پر، اور چوتھا نجومی اعمال (جوتش) پر۔ یہی انداز "زیج الغ بیگ" میں ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کا بھی پہلا مقالہ معرفت تواریخ میں ہے، دوسرا معرفت اوقات ومطالع میں، تیسرا ستاروں کی سیر وگردش کی معرفت میں، اور چوتھا نجوم (جوتش) پر

یہی نہیں بلکہ کارکنان رصد گاہ سمرقند نے "زیج ایلخانی" کی فلکیاتی دریافتوں ہی کو اپنی ہیئتی سرگرمیوں کی بنیاد بنایا اور موخر الذکر کی بہت سی دریافتیں جوں کی توں لے لیں، البتہ کچھ میں اپنی طرف سے اصلاح کی، چنانچہ اس رصد گاہ کے پہلے منتظم غیاث الدین جمشید کاشی سے[3] قاضی نور اللہ شوستری نے "مجالس المومنین" میں نقل کیا ہے کہ چاند گہنوں کو ہم نے خود رصد کیا ہے، اور انھیں اوصاف کی بنیاد پر قمر کے اوساط

[1] زیج الغ بیگ ورق ۲۵ [2] British Museum: Catalogue of Persian Manuscripts. P. 4-- [3] قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین ص ۳۲۸



وتعدیلات کی تصحیح کی ہے۔ باقی کواکب کے باب میں ہم نے "زیج ایلخانی" پر اعتماد کیا ہے۔

ہندوستان سے باہر رصد گاہ سمرقند اور "زیج الغ بیگ" پر عہد اسلام کی ہیئتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد ریاضی وہیئت کے علما ضرور پیدا ہوئے، مگر نہ تو کوئی قابل ذکر رصد گاہ ہی تعمیر ہوئی، اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں ہی پیدا ہوا، اس لیے یورپی فضلا عہد اسلام کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ رصد گاہ سمرقند پر ختم کر دیتے ہیں۔[1]

مگر یہ قلت مطالعہ اور کوتاہی فکر ونظر کا نتیجہ ہے، ہیئت وفلکیات کی ترقی عجم میں بند ہوگئی تو کیا ہوا، ہندوستان میں اس کی سرگرمیاں بڑی آب وتاب سے اٹھارویں صدی مسیحی تک[2] جاری رہیں، اور ان کے اندر گل سرسبد ادھیراج راجہ جے سنگھ سوائی کا نام ہے، انھوں دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں رصد گاہیں تعمیر کیں، جو رصد گاہ سمرقند کے انداز پر قائم کی گئیں تھیں، اور جن میں اسی قسم کے آلات رصدیہ استعمال کیے گئے تھے، اگرچہ بعد میں راجہ نے ان کے اندر کچھ اصلاحیں بھی کر دیں[3] اس طرح "زیج الغ بیگ" ہی کے انداز پر ایک نئی زیج مرتب کی جو اس نے اپنے بجائے اپنے آقائے ولی نعمت بادشاہ محمد شاہ کے نام معنون کی اور اس کا نام زیج محمد شاہی رکھا

**رصد گاہ سوائی راجہ جے سنگھ**

سوائی راجہ جے سنگھ نے یہ رصد گاہ مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۱۳۱ - ۱۱۶۱ھ) کے ساتویں سال جلوس یعنی ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں تعمیر کی اس رصد گاہ کی دریافتوں کی صحت کی تصدیق کے لیے اسی قسم کی رصد گاہیں، جے پور، اُجین، بنارس اور متھرا میں بھی بنوائیں، لیکن بدقسمتی سے بعد میں طوائف الملوکی اور

[1] ملاحظہ ہو Arnold: Legacy of Islam, P. 397 [2] اٹھارویں صدی کے ثلث اول میں مولوی غلام حسین جونپوری نے "جامع بہادر خانی" تصنیف کی (۱۸۳۳ء) [3] تفصیل آگے آرہی ہے۔

انحلال سلطنت کے نتیجے میں ملک کے اندر جو تباہی و بربادی پھیلی، اس کی وجہ سے یہ رصد گاہ بھی برباد ہو کر کھنڈروں کا ڈھیر ہو گئی۔

الغ بیگ کی رصد گاہ اور "زیج" کے برخلاف جو ایک خود پسند بادشاہ کے جذبہ خود نمائی کی آسودگی و تشفی کے لیے وجود میں آئی تھیں،[1] راجہ جے سنگھ نے یہ رصد گاہ اور بعد میں زیج محمد شاہی "خدمت خلق اور رفاہ عام کی غرض سے تعمیر اور تصنیف کیں۔ چنانچہ وہ خود اپنی "زیج" کے دیباچہ میں کہتا ہے، چونکہ جملہ مذہبی رسوم کی ادائیگی صحیح اوقات کے ساتھ مشروط ہے اور صحیح اوقات کا تعین مختلف مظاہر فلکی کے ظہور کے ساتھ وابستہ ہے جس کی معرفت کے دو ہی طریقے ہیں۔ مروجہ زیجوں اور تقویموں کی مدد سے بذریعہ حساب ان کا تعین اور برای العین مشاہدہ سے اس کی دریافت ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مطلع اکثر غبار آلود رہتا ہے، موخر الذکر طریقہ ہمیشہ قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عرصہ دراز سے یہاں حساب کا طریقہ مروج ہے، مگر اس میں یا تو پرانے گروں کا سہارا لینا پڑتا تھا، یا متداول زیجوں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا، (مثلاً عہد شاہجہانی سے پیشتر "زیج الغ بیگ" پر اور بعد میں زیج شاہجہانی پر) مگر ان زیجوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ امتداد زمانہ سے یہ قابل اعتماد نہیں رہی تھیں کیونکہ ان پر مبنی حساب کے ذریعہ مظاہر فلکی کے ظہور کا جو وقت مستخرج ہوتا تھا، برای العین

---

[1] زیج الغ بیگ ورق ۲ ط

"چون حضرت باری عز اسمہ۔ ۔ ۔ این بندۂ فقیر الغبیگ را بن گورگان ابن تیمور گورگان را که عظمی و کرمتے کبری تشرف اختصاص دا منیا زبخشید، خواست تا مضمون شعر۔ ان آثار نا تدل علینا　　فانظروا بعدنا الی الآثار بر کت بر غرائب روزگار نگاشتہ آید و رایت افتخار و اشتہار بر قمہ قبہ فلک دوار افراشتہ، رصد ستارگان اختیار فرمودہ"



مشاہدہ (مرصود) سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔

راجہ جے سنگھ نے اس مشکل کو بادشاہ محمد شاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جو علوم ریاضیہ میں راجہ ادھیراج کے تبحر علمی اور ہیئت وفلکیات میں اُن کی دستگاہ عالی سے اچھی طرح واقف تھا، راجہ کو حکم دیا کہ وہ علم ہیئت کے ماہرین کو جمع کر کے رصد گاہ قائم کرے اور اُس کی دریافتوں کی مدد سے ایک نئی "زیج" مرتب کرے، جس سے اس مشکل کا ازالہ ہو سکے، شاہی حکم کی تعمیل میں راجہ نے پہلے یہ رصد گاہ (جنتر منتر) قائم کی اور پھر اس کی فلکیاتی دریافتوں کی مدد سے ایک نئی زیج "(زیج محمد شاہی) مرتب کی۔

چنانچہ پہلے تو وہ اپنی ریاضیاتی حذاقت و مہارت کا ذکر کرتا ہے۔

"این خیر خواہ اصناف آفرینش و تماشا کار گاہ دانش بینش سوائی جے سنگھ از بدو فطرت و عنوان شعور بفن ریاضی مشغوف و مالوف بود و ہموارہ عنان طبعش بکشف دقائق و غوامض مصروف، و تبائید کرد گار از اصول و قوانین آن حظے وافر و نصیبے کامل حاصل کرد"[1]

اس کے بعد اس مذہبی اشکال کا ذکر کرتا ہے، جو قدیم زیجوں پر اعتماد کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

"استخراج تقادیم کواکب از زیجہائے متعارف۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اغلب و اکثر اوقات دور از مرصود و عیاں می یابند خصوصاً رویت اہلہ کہ حساب آن با مشاہدہ کم موافقت می کند۔ و حال آنکہ کارہائے مشترکہ ارباب ملل و نحل و اصحاب دین و دول بآں منوط و مربوط است۔ و ہمیں طور در اوقات ظہور و خفائے کواکب سیارات و ازمنہ کسوفات و خسوفات اکثر اوقات تفاوت فاحش روے می داد"[2]

---

[1] زیج محمد شاہی ورق اب　[2] ایضاً

لہذا سوائی راجہ جے سنگھ نے بادشاہ سے اس کا ذکر کیا۔ اور اس نے (بادشاہ نے)
اس کا حل یہی بتایا کہ خود راجہ ایک مستقل رصد گاہ قائم کرے اور اس کی فلکیاتی دریافتوں
کی مدد سے ایک نئی زیج مرتب کرے۔

"این معنی را بجناب ...... بادشاہ غازی محمد شاہ ...... رسانیدہ
فرمودند کہ چوں آں دانائے اسرار را درین امر مہارتے تمام است ہندسہ دانان
و منجمان فرقہ اسلام و برہمنان و دانایان فرنگ جمع نمودہ و آلات رصدی ساختہ
بتحقیق کار در رسیدہ، چناں سعی نماید کہ ایں اختلال کہ در زمان محسوب
امور مزبورہ و وقت مرصودہ ایشاں واقع می شود، مرتفع گردد۔"[1]

اس حکم کی تعمیل بغایت دشوار تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ نہ تو ہندو ہندوستان میں رصد بندی
کا چرچا رہا تھا۔ اور نہ مسلم ہندوستان میں۔ لیکن پھر بھی راجہ اس شاہی حکم کی تعمیل کے لئے
تیار ہو گیا۔

"ہر چند کہ این امر خطیر بود و مدت مدید شدہ کہ از راجہائے ذوی الاقتدار
کسے پیرامون آن نگردیدہ۔ و در فرقہ اسلام ہم از زمان شاہ شہید المغفور میرزا
الغ بیگ تا این زمان کہ زیادہ از سہ صد سال گزشتہ ہیچ یکے از سلاطین ذی شان
و صاحب مرتبان بلند مکان، باین کار متوجہ نشدہ، از برائے بجا آوردن فرمودۂ
ارفع اعلیٰ سر انجام کار مامورہ را نطاق ہمت بر کمر جان بستہ۔"[2]

**رصد گاہ کی تیاری** حسب تصریح سر سید احمد خاں[3] سوائی راجہ جے سنگھ نے بادشاہ محمد شاہ

[1] زیج محمد شاہی ورق ۲ ظ [2] ایضاً ورق ۲ ظ

[3] سر سید احمد خاں آثار الصنادید ص ۳۰۹



کے ساتویں سال جلوس ۱۱۳۶ھ میں تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے
اہم کام مناسب اور ضروری آلات رصدیہ کی فراہمی تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کسی
رصد گاہ کی کامیابی کا مدار کلیتاً قابل اعتماد آلات ہی پر ہے، مگر مشکل یہ تھی کہ نہ تو رصد گاہ
کے خصوصی معمار ہی تھے (اس ملک میں کبھی کوئی رصد گاہ تعمیر ہی نہیں ہوئی تھی) اور نہ جملہ
آلات رصدیہ ہی ملتے تھے، لے دیکے صرف ایک آلہ اصطرلاب ملتا تھا[1]۔ اس لیے ان کتابوں کی
مدد سے جو "آلات رصدیہ کی تیاری" کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، اس قسم کے آلات بنائے
گئے جیسے سمرقند کی رصد گاہ میں استعمال ہوتے تھے، رصد گاہ سمرقند کے آلات بڑے نفیس
تھے، اتنے نفیس کہ اس زمانہ (پندرہویں صدی مسیحی) میں یورپی رصد خانوں میں
ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گستاؤلی بان کی شہادت اوپر مذکور ہو چکی ہے۔
ایک اور مورخ علم الہیئت آرتھر بیری، ان کی نفاست کے بارے میں رقمطراز ہے،

"Nearly Two Centuries later Ullugh Beg ............ Built about 1420 An observatory At Samarqand ..... The instruments used were Extremely good"

بہر حال راجہ جے سنگھ نے پہلے کچھ دن تک رصد گاہ سمرقند کے آلات کے مانند آلات
بنوا کر استعمال کئے۔ لکھتا ہے،

[1] اور ہندوستانی ذہانت نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے لے کر گیارہویں صدی
ہجری تک اپنی پوری توجہ اصطرلاب سازی ہی میں جدت و اتقان پر مرکوز رکھی۔ آخری زمانہ
میں استاد اللہداد لاہوری اور اس کا خاندان اصطرلاب سازی میں اپنی حذاقت کیلئے مشہور تھا اور یہ صنعت
کوئی چار پشت تک اسکے خاندان میں رہی ان لوگوں کے بنائے ہوئے اصطرلاب اب بھی ملتے ہیں۔

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند از روے کتب اسلامیان در اینجا ہم ساخت، ذات الحلق برنجی بقطر سہ گز رایج این عصر کہ قریب ضعف ذراع اہل شرع است و ذات الثقبتین و ذات الشعبتین و سدس فخری و شاملہ[1]"

مگر راجہ کی دقت پسند طبیعت ان آلات کے استعمال سے مطمئن نہ ہو سکی، ان آلات میں دو نقص تھے،

۱۔ یہ چھوٹے تھے، (یا کم از کم اتنے بڑے نہ تھے کہ اجزا و دقائق میں نمایاں طور پر تقسیم کیے جا سکتے۔) ان کے دوائر کی تقسیم درجات سے زیادہ (مثلاً دقیقوں میں) نہیں کی جا سکتی تھی (ثانیوں وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا)

۲۔ یہ پیتل کے بنے ہوئے تھے، اس لئے کثرت استعمال سے ان کے جوڑ پیچ گھس جاتے تھے، اور مختلف دوائر کے قطب اور مراکز اپنی جگہ سے ہٹ جاتے تھے۔ اس لئے ان کے استعمال سے مختلف اجرام فلکی کی اوضاع کا تعین اور اُن کی سیر و گردش کی پیمائش حسب دلخواہ نہیں ہو سکتی تھی، راجہ نے لکھا ہے۔

"لیکن چوں آلہاے برنجی را بسبب خوردی و عدم تقسیم بدقایق و لغزش خوردن و ساییدہ گشتن قطب ہا و بیجا شدن مراکز و دوائر و اختلال وضع مقرری مطلوب [illegible] یعنی مثمر مدعا نیافت"[2]

لیکن راجہ نے درپیش مشکلات کا حل یہ نکالا کہ

۱۔ پیتل کے بجائے پتھر اور چونے سے بڑے مضبوط آلات رصدیہ بنائے تاکہ ان کے گھمانے پھرانے سے ان کے جوڑ پیچوں کے گھسنے کا احتمال نہ رہے، اور اسی طرح

---

[1] زیج محمد شاہی ورق ۲ ظ [2] ایضاً



دائرہ کے ہلنے اور ان کے اقطاب و مراکز کے اپنی جگہ سے ہٹنے کا اندیشہ جاتا رہا[1]۔

۲۔ آلات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے بنائے گئے۔ مثلاً راجہ کے اپنے اختراع کئے ہوئے سمراٹھ جنتر کا نصف قطر اٹھارہ گز تھا، اور اس کا ایک ایک دقیقہ (منٹ) ڈیڑھ جو کے برابر تھا[2]۔

۳۔ ان کی تیاری میں ہندسہ و ہیئت کے ضروری قواعد و قوانین کی باحسن وجوہ مراعات کی گئی۔ خط نصف النہار بڑی احتیاط سے کھینچا گیا، رصدگاہ کے عرض البلد کی تحقیق مزید کی گئی اور پیمائش میں غیر معمولی احتیاط برتی گئی ہے[3]۔

۴۔ دار السلطنۃ (شہر دہلی) کے علاوہ دوسرے بڑے شہروں سوائی جے پور، بنارس، متھرا اور اُجین میں بھی رصدگاہیں تعمیر کر کے ان میں ایسے ہی آلات نصب کئے گئے تاکہ مختلف رصدگاہوں کے طول البلد کے فرق و تفاوت کا لحاظ کرنے کے بعد ایک سے دوسری رصدگاہ کی دریافتوں کی صحت کی تصدیق کی جا سکے[4]۔

---

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۲ ظ "آلتہائے اختراعی خود ...... از سنگ و آہک باستحکام تمام و رزانت مالا کلام ...... تیار کردید تا بدین سبب خلل لرزش حلقہا و دوایر و سائیدن قطبہا و بیجا شدن مراکز و تفاوت دقایق برطرف گردید و برائے رصد طریق مستقیم پیدا گشت۔ [2] ایضاً۔ "آلتہائے اختراعی خود مثل ...... سمراٹھ جنتر کہ نصف قطر آن ہژدہ ذرعہ است و دقیقہ آن یک و نیم شعیرہ می شود" [3] ایضاً "آلتہائے اختراعی خود ...... با رعایت قوانین ہندسی و تحقیق خط نصف النہار عرض بلد و احتیاط در پیمائش ...... تیار کردید" [4] ایضاً۔ "و برائے آنکہا و حقیقت مدعا ہمیں قسم آلتہا در سوائی جے پور و متھرا و بنارس و اجین ہم بنا کردہ شد۔ چوں رصد ہائے این امکنہ را بعد از ملاحظہ تفاوت اطوال بلاد مقابلہ کردند محسوب با مرصود یکے آمد"

**آلات رصدیہ کی اصلاح و اختراع**

راجہ جے سنگھ کی اختراع پسند طبیعت عام آلات رصدیہ سو جن کے استعمال کا سابق کی رصدگاہوں (بالخصوص رصدگاہ سمرقند) میں رواج تھا، مطمئن نہ ہو سکی، لہذا اس نے دہلی کے چابک دست کاریگروں اور معماروں سے اپنے اختراع کردہ آلات رصدیہ تیار کرائے۔ ان میں سے تین آلوں کو، راجہ نے خصوصیت سے نام لیا ہے، جے پرکاش رام جنتر اور سمراٹھ جنتر[1]۔ قیام رصدگاہ کے کوئی ایک صدی بعد سر سید احمد خاں نے جب کہ وہ آثار الصنادید لکھ رہے تھے، اس رصدگاہ اور اُس کے آلات کو دیکھا تھا، جو بالکل خراب ہوگئے تھے، انھوں نے ان تین آلات کے خصوصی کھنڈروں کو بھی دیکھا تھا، اور ان کی حسب ذیل تفصیل قلمبند کی ہے:

"یہ رصدخانہ اب (یعنی ۱۸۴۷ء میں) بالکل خراب ہوگیا ہے، سب آلات ٹوٹ گئے ہیں، اور سب کی تقسیمیں مٹ گئی ہیں۔ کوئی آلہ اس قابل نہیں رہا کہ اس سے ایک بھی عمل ہو سکے۔

تین آلے منجملہ آلات کے جو چونے اور پتھر سے بنائے تھے، اب بھی ٹوٹے پھوٹے موجود ہیں۔

اول جے پرکاش۔ یہ آلہ بے حساب ظل کا ایک سطح مستوی پر عمود دبطور مقیاس کے قائم کرکے گرداس کے دائرہ افق تریپن فٹ آٹھ انچ کے قطر کا کھینچ کر اس پر چار درجے کی گول دیوار کوئیں کی کوٹھی کی طرح اٹھائی ہیں کہ ایک درجہ زمین میں دبا ہوا ہے، اور تین اوپر نکلے ہوئے ہیں۔ اُس کی ساٹھ پر تقسیم کی ہے، ایک خانہ کھلا بطور طاق کے اور ایک بند ہے، اندر کے رُخ مقنطرات کھینچے ہیں، اور درجات کی تقسیم کی ہے، اور مقیاس اور سطح اور افق اور مقنطرات سب کے سب منقسم ہیں۔

دوم رام جنتر۔ یہ آلہ ایک چبوترہ ہے، سلامی، شمال کی طرف سے بقدر عرض بلد اٹھا

---

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۲ ظ۔ "انتہائے اختراعی خود مثل جے پرکاش و رام جنتر و سمراٹھ جنتر ... تیار گردید"



اور اس پر چار قوسیں ہیں۔ اور ہر ایک قوس کے دونوں طرف سیڑھیاں بنا دی ہیں تاکہ سیڑھیوں پر چڑھ کر سائے کا حال دیکھیں۔ اس چبوترے کے نیچے سے دو قوسیں اور نکالی ہیں، معدل النہار، اور منطقۃ البروج کی، لیکن بقدر عرض بلد کے منحرف اور اس کی ہر ایک قوس پر تقسیم تھی کہ وہ بالکل مٹ گئی۔ اور قوسیں بھی اکثر ٹوٹ گئی ہیں۔

سوم سمراٹھ جنتر۔ یہ جنتر درحقیقت مقیاس ہے، ایک پاکھ بیچ میں بنا کر دائرہ معدل النہار جس کا نصف قطر اٹھارہ گز کا ہے، منحرف بقدر عرض بلد چونے اور پتھر سے نہایت مستحکم بنایا تھا۔ اس پر ساری تقسیم ہے، پاکھے پر سیڑھیاں بنائی ہیں کہ اس پر سے پاکھ کے سر پر چڑھ جاتے ہیں، اسی طرح دائرہ معدل النہار کے دونوں طرف سیڑھیاں بنائی ہیں کہ ان پر سے سائے کو دیکھتے تھے۔

اس جنتر کی بھی تقسیم بالکل خراب ہوگئی ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۲ء عیسوی میں پاکھے کی مرمت راجہ جے پور نے بموجب تحریک آرکیولاجیکل کمائٹی مقام دہلی کے کی۔ الا پوری مرمت نہیں ہوئی۔

یہ تینوں آلے خود سوائی جے سنگھ نے ایجاد کئے ہیں اور اسی سبب سے ان کے ہندی نام رکھے ہیں۔

کرۂ مقعر۔ اسی جنتر کے نیچے دو کرہ مقعر آدھے آدھے بنائیں، اس طرح پر کہ مدار قطب بروج کا ہر ایک میں ناقص ہے، اگر ایک کرہ کو اٹھا کر دوسرے کرہ پر رکھ دیں تو سارا کرہ پورا ہو جائے، ان کردن میں بارہ قوسین بنائی ہیں، تقسیم بروج کی چھ خالی اور چھ بھری۔ اور ہر جگہ تقسیم کے خطوط تھے، اور شاید قطب کی جانب میں تھا کہ اب وہ بھی ٹوٹ گیا، اور تقسیم بھی بالکل مٹ گئی۔ ہر خالی قوس میں زینے بنے ہوئے ہیں کہ ان پر سے

چڑھ کر سائے کا حال دیکھتے تھے۔ قطر ان دونوں کردں کا چھبیس ۲۶ فٹ کا ہے، اور چونے اور اینٹ سے نہایت مستحکم بنے ہوئے ہیں۔"[1]

ان تین چار آلوں کے علاوہ راجہ نے اور بھی آلات اختراع کئے تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مصرا جنتر

۲۔ راشی والیہ جنتر

۳۔ کرانتی ورتی جنتر

۴۔ دکشینو دارتی جنتر

۵۔ ششتما جنتر

۶۔ کپالا

۷۔ دگمسا جنتر

۸۔ تریوالیہ جنتر

ان آلات کے علاوہ رصدخانہ میں ذات الحلق اور اصطرلابات بھی تھے جنھیں راجہ نے جذبۂ احیائیت پسندی اور قومی تعصب کے تحت "چکرا تنتر" اور "تنتر راجہ" کے غیرمانوس ناموں سے موسوم کیا تھا۔ (باقی)

---

[1] سرسید احمد خان۔ آثار الصنادید صفحہ ۳۰۹-۳۲۱





# حافظ سخاوی

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کا زمانہ علوم و فنون کی گرم بازاری، منتخب روزگار فضلاء کی کثرت اور ایجادات و اکتشافات کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا عہد زریں قرار دیئے جانے کا مستحق ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ جس طرح ثمر بار ہوئی اس کی نظیر سابقہ صدیوں میں اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تذکرہ نویسی کے فن کو ان صدیوں میں حیرت انگیز ارتقاء حاصل ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں اس عہد کے مشاہیر اہل علم میں باہمی مسابقت کی ایک لہر آگئی تھی، ابن قیم ابو الفداء، ابن تیمیہ، ابن بطوطہ، ابن حجر، عینی، ابن اثیر، سیوطی، مقریزی اور سخاوی جیسے نادرۂ روزگار علماء نے اس عہد میں اپنی وسعت علم، بلندی فکر، مہارت فن، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کے لازوال نقوش قائم کئے ہیں، آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی اس غیرمعمولی اہمیت کے پیش نظر متعدد اہل قلم نے اس دور کے مشاہیر فضل و کمال کے حالات اور کارناموں پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر نے اپنی مشہور تصنیف "الدرر الکامنۃ" کی چار ضخیم جلدوں میں آٹھویں صدی کے ۴۹۷۶ اہل علم و فضل کے تراجم لکھے۔ علامہ شوکانی نے دو جلدوں میں

"البدر الطالع" تحریر کی جو ۱۱۹۵ تراجم پر مشتمل ہے، جلال الدین سیوطی نے اپنی مختصر مگر جامع تصنیف "نظم العقیان" میں دو سو[۱] ارباب کمال کی علمی سرگرمیوں سے بحث کی، بقاعی نے "عنوان الزمان فی تراجم الشیوخ والاقران" کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی لیکن اس موضوع پر حافظ سخاوی کی "الضوء اللامع" سب سے اہم ہے[۲] انھوں نے بارہ جلدوں میں نویں صدی ہجری کے گیارہ[۳] ہزار سے زاید علماء اور عالمات کے حالات اور علمی کارناموں کا بڑا دلکش مرقع تیار کیا ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں سخاوی کی غیر معمولی محنت، وسعت علم اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس عہد زریں میں مختلف اسلامی علوم وفنون کے ارتقاء کی ایک تابناک تصویر بھی نظر کے سامنے آجاتی ہے، ذیل کی سطور میں حافظ سخاوی کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

**نام ونسب** حافظ سخاوی کا نام محمد، کنیت ابوالخیر، اور لقب شمس الدین تھا، آبائی وطن سخا تھا، اس کی نسبت سے سخاوی کہلاتے ہیں، سخا[۴] مصر کے مغربی جانب ایک چھوٹی سی بستی تھی، لیکن متعدد وجوہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوئی[۵] مصر کا یہ خطہ اپنی مردم خیزی میں بہت ممتاز تھا، چنانچہ تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں سخوی اور سخاوی کی نسبت متعدد علماء کے ساتھ درج ہے،[۶] لیکن حدیث وتاریخ میں جب مطلق سخاوی بولا جاتا ہے تو اس سے حافظ محمد بن عبد الرحمن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد سخاوی ہی مراد ہوتے ہیں،[۷] حافظ سخاوی کا خاندان بعد میں قاہرہ منتقل ہوگیا، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی،

[۱] الانساب ج ۱ص ۱۰ احمدیہ ایڈیشن حیدرآباد دکن معجم المطبوعات دوم ص ۱۰۱۲ [۲] معجم البلدان جلد ۵ ص ۴۶ [۳] الانساب ۱۰۱/۱ [۴] کتاب الکنی والانساب ج ۲ ص ۲۸۴ بحوالہ فوائد جامعہ ص ۴۰۵



**ولادت وخاندان** حافظ سخاوی ربیع الاول ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں قاہرہ میں پیدا ہوئے،[۱] جب وہ چار سال کے ہوئے تو ان کے والد نے حافظ ابن حجر کے قریب ایک مکان خریدا اور وہاں منتقل ہوگئے۔

حافظ سخاوی کا خاندان علم وفضل اور زہد واتقاء کے اعتبار سے "سلسلۃ الذہب" کی حیثیت رکھتا ہے، ان کے دادا اور والد دونوں اپنے فضل وکمال کی وجہ سے بہت مشہور تھے، دادا محمد بن ابو بکر ابن البارد کے لقب سے مشہور تھے۔[۲] انھوں نے مصر کے نامور شیوخ سے حدیث ومتعلقات حدیث میں مہارت کاملہ حاصل کی، سیرت نبوی سے خاص شغف تھا، اور سیر ومغازی میں صاحب نظر سمجھے جاتے تھے، علمی کمال کے ساتھ عبادت وریاضت، تقوی وطہارت اور اخلاق ومعاملات کا مثالی پیکر تھے، اہل وعیال کی کفالت کے لئے سوت کی تجارت کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ شام بھی تشریف لے گئے، لیکن اس سفر میں انھوں نے صرف سیم وزر ہی کی فکر نہیں کی بلکہ بیت المقدس وغیرہ کے مشاہیر اہل علم سے اکتساب فیض کی بھی کوشش کی، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کے سوانح وکمالات پر بہت شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ان کی بزرگی وتقوی کے بارے میں رقمطراز ہیں،

| | |
|---|---|
| قال لی العلاء البلقینی | مجھ سے علاء بلقینی نے بیان کیا کہ ان |
| انہ کان من یراہ یشہد | (محمد سخاوی) کو جو شخص بھی دیکھتا |
| بولایتہ وصلاحہ وما | ان کی بزرگی اور نیکی وتقوی کی |
| لقیت أحدا ممن یعرفہ | شہادت دیئے بغیر نہیں رہتا تھا کے |

[۱] الضوء اللامع ۲/۸ [۲] الضوء اللامع ۱۶۲/۷

إلا واثنى عليه بالصلاح والخير[1]

شناساؤں میں سے میری جس سے بھی ملاقات ہوئی اسکو ممدوح کی نیکی وپاک طینتی کا ثنا خوان پایا۔

سخاوی کے والد امام عبدالرحمن بن محمد بھی بہت جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے، علامہ ابن حجر اور شیخ عزالدین بن جماعۃ وغیرہ جیسے اساطین علم کے زیر سایہ انھوں نے جملہ علوم وفنون میں ایسی دستگاہ حاصل کی کہ اکابر محدثین و رواۃ کی ایک جماعت نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اپنے والد کی طرح یہ بھی سوت کی تجارت کرتے تھے،

حافظ سخاوی نے الضوء اللامع کی چوتھی جلد میں اپنے والد کا تذکرہ بھی ایک سعادت مند فرزند کی طرح نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ تفصیل سے لکھا ہے، اس میں انکی جامع شخصیت کی اس طرح مرقع کشی کی ہے۔

"وہ نہایت عالم وفاضل، زود فہم، نیک و دیندار، راستباز، عہد کے پابند، امانتدار، زکوۃ دینے والے، نہایت خیر خواہ بے ضرر، متواضع رقیق القلب اور باوقار تھے، اعزہ واقربار کے ساتھ بہت صلہ رحمی کرتے تھے، فجر اور عشار کی جماعت کے خصوصیت کے ساتھ پابند تھے، اور اس معمول میں تا عمر کبھی فرق نہیں آیا، علاوہ ازیں وہ بکثرت تلاوت کرتے، اپنی کوتاہی کا کھلے دل سے اعتراف کر لیتے اور بہت جلد آبدیدہ ہو جاتے تھے، ان کے قدیم ساتھیوں مثلاً زین الدین قاسم حنفی، سید الجرد انی نقیب، اور ابن المرحم وغیرہ میں سے جس سے بھی میری ملاقات ہوئی، اس نے ان کے بارے میں کلمۂ خیر ہی کہا۔[2]"

1 الضوء اللامع ۷/۱۶۶ 2 الضوء اللامع ۴/۱۲۵



بالآخر ۲۸ رمضان ۹۰۲ھ کو یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔

**تعلیم وتربیت** مذکورہ بالا خاندانی حالات سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حافظ سخاوی نے علم وفضل کی دولت ورثہ میں پائی تھی، ابتدائی تعلیم ایک مقامی شیخ عیسیٰ بن احمد سے حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے پھوپھا حسین بن احمد الازھری کی خدمت میں چلے گئے، اور وہاں حفظ قرآن کیا، اس کے بعد اپنے عہد کے مختلف شیوخ واساتذہ کی بارگاہ علم میں زانوئے تلمذ تہ کر کے تفسیر وتجوید، فقہ وحدیث، نحو وادب، فرائض وحساب اور تاریخ وہئیت میں کمال بہم پہنچایا، انھوں نے بہت سی درسی کتابیں الفیہ عراقی، نخبۃ الفکر، شاطبی عمدۃ الاحکام، التنبیہ، جامع مختصرات وغیرہ حفظ کر کے اساتذہ کو سنائیں، نحو وادب میں وہ ابن ہشام حنبلی، اور امام نحو شہاب حناوی کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔[1]

طلب علم کے غیر معمولی شوق نے حافظ سخاوی کو دور دراز ملکوں کے سفر پر بھی آمادہ کیا، چنانچہ وہ اس سلسلہ میں دمشق، حلب، بیت المقدس، نابلس، حماۃ، ومیاط اسکندریہ وغیرہ مصر وشام کے تمام مشہور علمی سرچشموں تک پہونچے اور سیراب ہوئے۔[2] عیدروسی کہتے ہیں۔

وجاب البلاد وجال ... — انھوں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت
والاماكن التي تحمل فيما من — کی اور ان مقامات کی تعداد جہاں کی
البلاد والقرى على الثمانين — انھوں نے خاک چھانی اسّی سے زائد ہے
بحيث أن الذي سمع عنهم — اور وہاں انھوں نے جن اساتذہ سے
يكونون قريب مائة نفر ... — کسب فیض کیا ان کی تعداد سو بلکہ

1 النور السافر ص ۱۶، 2 الضوء اللامع ۳ تذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۸ ص ۱۵ اور البدر الطالع ۲/۱۸۴

زاد عدد من أخذ عنہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

**شیوخ و اساتذہ**

کسی صاحب علم کے علوئے مرتبت اور جلالت شان کا اندازہ کرنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اسکو کتنے اور کس مرتبہ کے اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا ہے، اس بات میں سخاوی کو جو امتیاز حاصل ہے، اس کی نظیر ہم عصر علماء میں خال خال ہی نظر آتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کثیر التعداد اساطین فن اور یگانۂ عصر ائمہ کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کی تھی، طبقات و تراجم کی کتابوں اور خود الضوء اللامع میں ان کے اساتذہ کی طویل فہرست ملتی ہے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ان کے بخاری کے اساتذہ کی تعداد ایک سو بیس بتائی ہے۔[2] عیدروسی نے لکھا ہے کہ "سخاوی نے لاتعداد شیوخ سے تحصیل علم کی، یہاں تک کہ ان کے اساتذہ کی تعداد چار سو سے بھی متجاوز ہے"[3] اساتذہ کی پوری فہرست طوالت کے خوف سے نہیں دی جا رہی ہے، صرف چند نامور اصحاب کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

قاضی محب ابن شحنہ، علامہ عینی، کمال بن ہمام، تقی الدین ابن فہد، صالح بلقینی قاضی مصر بدر الدین، ابوالفتح اللفوی، حافظ ابن حجر وغیرہ،

کمال ابن ہمام معقول و منقول کے امام تھے، اور تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، فرائض و حساب نحو و بلاغت، منطق و مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، سخاوی عرصہ تک ان سے استفادہ کرتے رہے انھوں نے "عالم دنیا اور محققِ دوراں کے القاب سے انکی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔[4]

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کے دونوں مشہور شارح ابن حجر عسقلانی

۱ النور السافر ص ۱۱، ۲ ابراز الغی ص ۱۲، ۳ النور السافر ص ۱۶، ۴ البدر الطالع ۲/۲۰۱



(صاحب فتح الباری) اور حافظ عینی (صاحب عمدۃ القاری) ان کے مایۂ ناز استاذ تھے، حافظ عینی ابن حجر کے ہم پلہ تھے، انکی خدمت میں سخاوی حاضر ہوئے، اور ان کے فضل و کمال سے بہرۂ وافر حاصل کیا، وہ ان کی مہارت فن، جامعیت علوم اور مقام بلند کے بے حد معترف تھے۔[1] انہیں تخریج احادیث اور ان کے معانی کی وضاحت میں کامل عبور حاصل تھا، وہ تمام علوم پر وسیع نظر رکھتے تھے۔[2]

ابن حجر نے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصنیف و تالیف میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، اور زبان خلق سے حافظ العصر، خاتمۃ الحفاظ، امام الائمہ، فرید الوقت جیسے بلند خطابات پائے، یوں تو وہ جامع العلوم تھے، لیکن حدیث و رجال میں ان کی مہارت کا انکے شیوخ کو بھی اعتراف تھا، حافظ عراقی نے انھیں "اعلم اصحاب الحدیث"[3] قرار دیا ہے، علامہ سیوطی نے کہا کہ "ان پر علم حدیث کا خاتمہ ہوگیا"[4] ابن حجر سے سخاوی کو استفادہ کا بہت موقع ملا ان کی عالمانہ شفقت اور سخاوی کی طالب علمانہ سعادت نے انھیں امامت کے درجہ پر پہونچا دیا۔

**ابن حجر سے خصوصی تلمذ**

سخاوی ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں استاذ و شاگرد کے باہم اتنے والہانہ اور گہرے تعلق کی مثالیں بہت نادر ہیں سخاوی ۸۳۸ھ میں اپنے والد کے ہمراہ پہلی بار ابن حجر کی بارگاہ فضل و دانش میں تحصیل حدیث کے لیے باریاب ہوئے تھے، پھر تا عمر حافظ العصر کے دامن سے وابستہ رہے قرب مکانی کے باعث ان کو استفادہ کا زیادہ سے زیادہ موقع بھی نصیب ہوا تھا

۱ الضوء اللامع ۱۰/۱۳۳، ۲ الفوائد البہیہ ص ۱۸۶،

۳ ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۱ ۴ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۳

ابن حجر کی بھی ؛ ہونہار، لائق اور سعادت مند شاگرد پر خصوصی نظر تھی، اور وہ ان کی ذہانت و صلاحیت کے معترف تھے، تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ حافظ العصر کے تمام تلامذہ میں کوئی بھی تبحر علمی اور معارف ابن حجر پر عبور میں ان کا شریک و سہیم نہیں،[1] خود ابن حجر اکثر کہا کرتے تھے۔ "لیس الآن فی جماعتی مثلہ"[2]

حافظ سخاوی نے ابن حجر کی طویل صحبت سے فائدہ اٹھا کر اسماء الرجال کی معرفت رواۃ کی شناخت، حفظ حدیث اور جرح و تعدیل میں اختصاص حاصل کر لیا تھا۔[3] سخاوی نے اپنی تصنیف "البتر المسبوک" میں خود اعتراف کیا ہے کہ "میں عمر بھر ان سے وابستہ رہا یہاں تک کہ ان کا پورا پورا علم حاصل کر لیا، اور مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میں نے بہت سے علوم میں انفرادیت حاصل کر لی، میں ان کی فرودگاہ سے قریب ہی سکونت پذیر تھا، اس لئے ان کے درس کا کوئی درس مجھ سے ناغہ نہیں ہوتا تھا، حافظ صاحب اکثر مجھے قرأت کے لیے بلوا بھیجتے تھے۔[4]

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "کم سنی میں حافظ ابن حجر کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں لکھیں؛ جس سے ان کو خصوصی شغف پیدا ہو گیا، پھر تو وہ مستقل ان سے وابستہ ہو گئے، اور بکثرت کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں۔"[5]

برہان باعونی کا بیان ہے کہ

| | |
|---|---|
| قد حصل الاجتماع بخدمۃ | وہ ابن حجر کی خدمت میں حاضر ہوئے |
| ابن حجر، والفوز ببرکتہ | اور ان سے خیر و برکت حاصل کرتے |

---

[1] برانا افقی ص ۱۱، [2] الضوء اللامع ۲/۴ [3] الکواکب السائرۃ جلد ۱ ص ۵۳، [4] البدر الطالع ۲/۱۰۰، النور السافر ص ۱۲ [5] فتح الباری ج ۱ ص ۴ [6] نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۱۵۲



| | |
|---|---|
| والاقتباس من فوائدہ | علاوہ شیخ کے علوم اور امتیازات |
| والاستمتاع بفرائدہ[7] | سے پورا پورا استفادہ کیا۔ |

سخاوی نے ابن حجر سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھی تھیں، ان میں سے کچھ کے نام النور السافر میں درج ہیں۔[8]

سخاوی کی اپنے شیخ سے غایت عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے "البتر المسبوک" میں انکا تذکرہ لکھا ؛ فرید بر آن الضوء اللامع میں نہایت جذباتی انداز میں اور فرط احترام کے ساتھ "قال شیخنا" کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ایک جگہ انھوں نے صراحت سے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| وکل ما اطلقت فیہ شیخنا | جہاں بھی میں مطلقاً شیخنا کہوں تو |
| فما ادی بہ ابن حجر استاذنا[9] | اس سے ہمارے استاذ ابن حجر مراد ہوں گے۔ |

امام شوکانی استاذ و شاگرد کے فرط تعلق کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

| | |
|---|---|
| وقد غلبت علیہ محبۃ شیخہ | امام سخاوی پر اپنے استاد ابن حجر |
| الحافظ ابن حجر فصار لا یخرج | کی محبت غالب تھی، چنانچہ وہ ان کے |
| عن غالب اقوالہ کما غلبت | اکثر اقوال کے دائرہ سے نہیں نکلتے |
| علی ابن قیم محبۃ شیخہ ابن تیمیۃ | تھے، جیسا کہ ابن قیم پر اپنے استاد ابن تیمیہ اور ہیثمی پر اپنے شیخ عراقی کی |
| وعلی الهیثمی محبۃ شیخہ | |
| العراقی[10] | محبت کا غلبہ تھا۔ |

---

[7] الضوء اللامع ۸/۲۰، ۲۱، [8] النور السافر ص ۱۱، [9] الضوء اللامع جلد ۱ ص ۵، [10] البدر الطالع ۲/۱۸۹

**محدث خواتین**

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں جب کہ عالم اسلام کا گوشہ گوشہ حدیث و روایت کے آوازہ سے معمور تھا، بہت سی خواتین بھی علم حدیث میں مہارت تام رکھتی تھیں، اور جا بجا ان کی بساط ہائے درس بھی آراستہ تھیں، دنیا کے کونہ کونہ سے تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے، سخاوی نے الضوء اللامع کی بارہویں جلد میں ایسی نامور خواتین کے حالات و خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، ان میں سے بہت سی ایسی تھیں جن سے انھیں سماع حدیث کا شرف اور سند و اجازت کے حصول کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ان میں حافظ ابن حجر کی اہلیہ آنسہ بنت عبدالکریم[1] حافظ عراقی کی صاحبزادی جویریہ[2] خدیجہ بنت علی[3]، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

**تبحر علمی**

حافظ سخاوی کی ذات بڑی ہمہ گیر اور جامع کمالات تھی، لیکن حدیث اور اس کے متعلقات ان کے فکر و نظر کے اصل جولانگاہ تھے،[4] غیر معمولی قوت حافظہ کی وجہ سے ہزاروں حدیثیں ان کے نہان خانۂ دماغ میں محفوظ تھیں، اسی باعث اپنے استاد ابن حجر کی طرح زبان خلق سے "حافظ" کا لقب حاصل کیا تھا، جو آج تک ان کے نام کا لازمی جزو ہے،

علامہ شوکانی جیسے صاحب نظر عالم نے حفظ حدیث میں ان کی بلندی مرتبت کی شہادت دی ہے: "حفظ حدیث میں حافظ سخاوی اپنے ہمعصروں میں منفرد تھے"[5]

ان کے تلمیذ رشید حافظ جار اللہ ابن فہد نے اپنے استاد کے دیرینہ تجربہ کے بعد تبحر علمی کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے۔

۱؎ الضوء اللامع ۱۲/۱۱ ۲؎ ایضاً ص۱۶ ۳؎ ایضاً ص۲۵ ۴؎ بدائع الزہور فی وقائع الدہور ۳/۳۲۱ ۵؎ البدر الطالع ۲/۱۸۶



ولا أعلم الآن من يعرف علوم الحديث مثله ولا أكثر تصنيفا ولا أحسن ولذلك أخذ عنه علماء الآفاق من المشايخ والطلبة والرفاق، وله اليد الطولى في المعرفة بالعلل وأسماء الرجال واليه يشار في ذلك۔ ولقد مات فن الحديث بعده[1]

مجھ کو کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جو علوم حدیث کی معرفت اور کثرت تصنیفات میں سخاوی کا مثیل و نظیر ہو، اسی باعث چار دانگ عالم کے علماء، شیوخ اور طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا، ان کو اسماء الرجال اور معرفت علل پر کامل دستگاہ حاصل تھی ان کے بعد علم حدیث کا خاتمہ ہو گیا۔

کسی شاگرد کی لیاقت کی حد ہے، اگر اس کے اساتذہ اس کی تعریف کریں ان کے اساتذہ میں عینی اور حافظ ابن حجر کا بیان پہلے گزر چکا ہے، تقی الدین ابن فہد اور دوسرے نامور استاد بھی علم حدیث میں ان کے کمال و رفعت کے قائل تھے،[2]

**درس و افادہ**

جب تک ابن حجر حیات رہے، سخاوی ان کی خدمت سے جدا نہیں ہوئے لیکن استاد کی وفات کے بعد ان کے فیض کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اپنی مجلس درس قائم کی جلد ہی ان کی شہرت دور دور پہونچ گئی، اور کونے کونے سے تشنگان علم اس چشمۂ صافی کے گرد جمع ہونے لگے، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی املاء حدیث کی مجلسوں سے بے شمار طلبہ مستفید ہوئے۔[3] پہلے اپنے مکان ہی پر درس کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پھر دار الحدیث الکاملیہ

۱؎ شذرات الذہب ۸/۱۶ و فتح المغیث خاتمہ ص۵۰۳ ۲؎ الضوء اللامع ۸/۲۰ ۳؎ ایضاً ص ۱۵

مدرسہ ظاہریہ اور برقوقیہ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں[۱] ۸۷۰ھ میں حج سے مشرف ہوکر قاہرہ واپس آئے تو چھ سو سے زائد مجالس املار میں طلبہ کو اپنے افادات سے مستفید کیا،[۲] ان حلقہائے درس میں عام طالب علم سے لیکر اکابر علماء تک شریک ہوتے تھے درس حدیث میں ان کے غیر معمولی انہماک کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حکومت کی طرف سے بڑے اصرار کے ساتھ ان کو منصبِ قضا پیش کیا گیا تو اس سے محض اس لئے انکار کر دیا کہ اس کے بعد تدریس کے لیے فراغ خاطر باقی نہ رہے گا۔[۳]

**زیارت حرمین** سخاوی نے اپنے استاد ابن حجر کی زندگی بھر گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، یہاں تک کہ دل کے شدید تقاضے کے باوجود حج بیت اللہ سے بھی مشرف نہیں ہوئے، ان کے انتقال کے بعد ۸۵۵ھ میں اپنے والدین کے ہمراہ عازم حرمین ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت کے ساتھ علماء حرمین کے فیوض علمی سے بھی بہرہ ور ہوئے، وہاں انھیں علامہ برہان زمزمی، تقی الدین ابن فہد ابو الفتح الاغر، اور ابن ظہیرہ جیسے فخر روزگار ائمہ علم سے استفادہ کا موقع ملا،[۴] حرمین میں ایک سال قیام کے بعد قاہرہ واپس آئے۔ اس کے بعد پھر ۸۷۰ھ ، ۸۸۵ھ اور ۸۹۲ھ میں ۳ بار حرم پاک اور آستانۂ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کیا، ہر سفر میں برسوں وہاں قیام کرکے افادہ و استفادہ میں مشغول رہے، ان کے آخری لمحات اسی سرزمین مقدس پر قال اللہ وقال الرسول کے سرمدی نغمے بلند کرتے ہوئے گزرے، اور بالآخر اسی خاک کا پیوند ہوئے۔[۵]

(باقی)

---

۱؎ الضوء اللامع ج ۸ ص ۳۱ ۲؎ ایضاً ص ۱۴، ۳؎ النور السافر ص ۲۱

۴؎ النور السافر ص ۱۰، ۵؎ انوار الباری ص ۱۹۵ و فوائد جامعہ ص ۴۴



# علامہ محمد اقبالؒ کی صد سالہ سالگرہ
# کی
# بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از۔ سید صباح الدین عبدالرحمن

دہلی بہت آرام سے پہونچا، اسٹیشن پر مکرمی ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری کے بڑے صاحبزادے محمد طارق سے ملاقات ہوگئی، ان کی وجہ سے بڑا آرام پہونچا، پاکستانی سفارت خانہ میں پریس کونسلر محمد عظیم صاحب بڑے اخلاق سے ملے، اور بتایا کہ اقبال کا صد سالہ جشن لاہور کے علاوہ کراچی اور اسلام آباد میں بھی منایا جائے گا، اس لئے کراچی اور اسلام آباد کا ویزا بھی بنا دیا گیا ہے، پاکستان انٹرنیشنل ایرویز کے دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ لکھنؤ چلا گیا ہے، لکھنؤ سے ٹکٹ واپس منگایا جائے گا اس لئے سفر میں قدرے تاخیر ہوگی، اور کہیں پہلی دسمبر کو روانگی ہوسکے گی، پہلی دسمبر کو پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں سے اور علی سردار جعفری بھی بمبئی سے دہلی آگئے، اور ہم سب چار بجکر بیس منٹ پر پالم سے روانہ ہوئے، اور سوا گھنٹے میں لاہور پہونچ گئے، ہوائی جہاز کے عملے نے بڑی پذیرائی کی، اور یادگار کے طور پر ہم لوگوں کی تصویر لینے کی خواہش کی، پروفیسر آل احمد سرور اس دن ساتھ نہ آسکے، وہ بعد میں پہونچے۔ لاہور ہوائی اڈے پر بڑا پرجوش

استقبال کیا گیا، انٹرکانٹیننٹل ہوٹل میں ہم لوگوں کے لیے کمرے پہلے ہی سے متعین کیے جا چکے تھے، یہ دنیا کا بہترین ہوٹل سمجھا جاتا ہے، پاکستان میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئی ہیں، دوسرے مندوبین بھی یہیں ٹھہرائے گئے تھے، دوسرے دن صبح سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا ذکر برابر آتا رہا ہے، وہ دار المصنفین کے عاشق بھی ہیں اور محسن بھی گزشتہ سال حکومت پاکستان سے دار المصنفین کی کتابوں کے حقِ طباعت کے سلسلہ میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں ان کا نمایاں حصہ تھا، پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں۔ ان کی "شعرائے کشمیر" جو کئی جلدوں میں ہے بہت مقبول ہے، انگریزی، اردو اور سندھی میں بکثرت کتابیں لکھی ہیں، میری نظر میں وہ پاکستان کے Prince. Schol پہیں، انتہائی محبت سے ملے، گلے لگایا، اور حالات پوچھتے رہے، ان کی صحت ادھر گر رہی ہے، کئی آپریشن کرا چکے ہیں، میرے آنے کے تیسرے دن ان کو قلب کا دورہ پڑ گیا اور اسپتال میں داخل کر دئے گئے، اس سے میری خوشی افسردگی سے بدل گئی، حالی دہلی غالب سے ملنے کے لئے آتے تھے، میں پاکستان آتا ہوں تو وہ پیش نظر ہوتے ہیں، مجھ کو اس طرح نوازتے ہیں، کہ میں کہتا ہوں کہ میرا اصلی پاکستان ان کا دولت کدہ ہے، ان کے اسپتال جانے سے میں بے کیف ہو گیا، دیکھنے گیا، الحمد للہ اچھے تھے، امید ہے کہ جلد مکمل صحت ہو جائے گی، ان کے لیے ہر بن مو دعا گو ہے، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق بھی ان کی عیادت کے لیے اسپتال تشریف لائے تھے، ان کے ساتھ ہوٹل میں پروفیسر عبد الرشید بھی تھے، جنھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریباً چوالیس سال زندگی گذاری ہے، پروفیسر محمد حبیب کے بعد عرصہ تک



وہاں کے شعبۂ تاریخ کے صدر بھی رہ چکے ہیں، اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر باتوں میں بالکل جوان ہیں، بہت ہی دلچسپ اور ظرافت آمیز گفتگو کرتے ہیں علی گڑھ کے عاشقوں میں سے ہیں، گھنٹوں علی گڑھ سے متعلق باتیں کرتے ہیں، وہاں کی جزوی باتوں سے بہت باخبر ہیں بعض چیزیں تو میرے لیے بھی نئی تھیں، میری تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، علی گڑھ کے رشتہ سے بڑی محبت سے ملے، جناب راشدی صاحب ہی کے کمرے میں پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ملاقات ہوئی، جن سے امیر خسرو کے جشن صد سالہ کے موقع پر برابر بے تکلفانہ انداز میں ملنے کا موقع ملا تھا، نسلاً کشمیری ہیں، ایم۔اے کی ڈگری بنارس ہندو یونیورسٹی سے حاصل کی، سنسکرت اچھی طرح جانتے ہیں لندن یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی، مشرقی پاکستان میں آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ، پھر ڈھاکہ میں شعبۂ تاریخ میں ریڈر رہ چکے ہیں، پشاور یونیورسٹی میں بھی رہے، آج کل اسلام آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، بڑے اچھے مقرر ہیں، مختلف موضوعات پر ۲۳ کتابیں لکھ چکے ہیں،

ان کتابوں میں پاکستان کے گندھارا آرٹ اور پاکستان کی مختصر تاریخ بھی شامل ہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ان علمی خدمات کی بنا پر ان کو ستارۂ امتیاز بھی ملا ہے، بارہ جلدوں میں ایک مفصل تاریخ پاکستان بھی پیش نظر ہے، اس سلسلہ میں کہتے تھے کہ پروفیسر شیخ عبد الرشید نے ان سے کہا کہ اب یہاں یہ رجحان ہو گیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ ۱۹۳۰ء سے شروع کی جاتی ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے، اس عہد کے مسلمانوں کی تاریخ پر بھی زور دینا چاہیے، سیاسی اور جنگی تفصیلات سے قطع نظر اس دور میں جو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حالات رہے ہیں ان کو پورے طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ

دارالمصنفین میں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان کی تعریف کی، پروفیسر دانی نے میری لکھی ہوئی تاریخیں خود پڑھی ہیں، اور طلبہ سے بھی پڑھوائی ہیں، بزم مملوکیہ میں میں نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے ساتھ ان کے معاصر مشہور شاعر شمس دبیر بھی دہلی سے بنگال گئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد امیر خسرو دہلی واپس آگئے، مگر شمس دبیر وہیں رہ گئے، دانی صاحب نے بتایا کہ یہ شمس دبیر آگے چل کر بنگال کے سلطان ہو گئے تھے، ان کی یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی میں نے کہا اس بارہ میں خاصی تحقیق کی ضرورت ہے۔

سید حسام الدین راشدی صاحب کے کمرہ ہی میں بشیر احمد ڈار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ پہلے کراچی میں تھے، اب اپنے وطن لاہور چلے آئے ہیں، راشدی صاحب پروفیسر عبدالرشید اور ڈار صاحب ایک دوسرے کے فدائی اور شیدائی ہیں، کراچی جب بھی آنا ہوا تو ان تینوں حضرات کی مجلسوں میں شرکت کا موقع ملا بڑی دلچسپ علمی صحبت ہوتی تھی، بذلہ سنجیوں اور زمزمہ سنجیوں کی بڑی رنگین بہاریں دیکھنے میں آتی تھیں، ڈار صاحب بڑے مخلص مسلمان ہیں، خداترسی اور صداقت شعاری کے ساتھ وضعدار بھی بے مثل ہیں، اور اقبالیات کے ماہر ہیں، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں، اقبال بزم اقبال اور پاکستان فلوسفیکل جرنل کے اڈیٹر بھی تھے

اقبال پر ان کی حسب ذیل کتابیں ہیں، (۱) اقبال، (۲) اے اسٹڈی ان اقبال فلوسفی (۳) اقبال اینڈ پوسٹ کینٹشین ولنٹرزم (Iqbal and Post Kantian voluntarism) اقبال کی گلشن راز جدید اور پس چہ باید کرد کا ترجمہ کر چکے ہیں، اور اب مسافر اور محراب گل افغان کا ترجمہ کر رہے ہیں، اقبال کے خطوط اور مضامین بھی ایڈٹ کر کے شایع کیے ہیں، ان کے علاوہ انگریزی میں بکثرت



مضامین لکھے ہیں، لیکن اپنے علمی کارناموں کے باوجود بہت ہی منکسر مزاج اور قناعت پسند ہیں، کسی اعزاز کے نہ خواہاں ہیں، نہ جویاں، ان سے ملنے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنے کسی قریبی شفیق بزرگ سے مل رہا ہوں، جب کہیں ملاقات ہو جاتی ہے، بہت ہی خلوص اور شفقت سے ملتے ہیں، دارالمصنفین کے بڑے قدر داں ہیں، جس بزرگانہ محبت سے وہ مجھکو راشدی صاحب کی عیادت کے لیے اپنے ساتھ اسپتال لے گئے اس کی یاد کی شمع میرے ذہن میں برابر روشن رہے گی۔

ہوٹل ہی میں جناب نبی احمد بلوچ سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا ہماری مطبوعات کے حق طباعت کے سلسلہ میں دارالمصنفین اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے درمیان معاہدہ کے بارہ میں غیر معمولی مدد کی تھی، وہ اخلاق و شرافت کا پیکر ہیں، ان کا دل دیکھا جائے تو شاید گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگین اور حسین نظر آئے، پہلے سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے، پھر حکومت پاکستان کے ثقافتی امور کے سکریٹری ہو گئے، آج کل آثار قدیمہ، کلچر اور اسپورٹس ڈویزن کے افیسر آن اسپشل ڈیوٹی ہیں، اقبال کے صد سالہ جشن کی بہت سی ذمہ داریاں بھی ان کے سر تھیں، ہر وقت مہمانوں کی خاطر داری بلکہ مزاج داری میں لگے رہتے تھے، علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے، اس لئے علی گڑھ والوں سے بڑی محبت سے ملتے ہیں، سندھی اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں،

جناب قدرت اللہ شہاب سے بھی ملاقات ہوئی، جو دارالمصنفین کے بڑے عنایت فرما ہیں، ذمہ دارانہ مصروفیت کے باوجود مختلف کتابوں کے مصنف بھی ہیں بزرگان دین سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں، اخلاق و مروت کے پیکر ہیں، گفتگو میں بڑی شیرینی ہے، اور ہر وقت دلدہی و دلجوئی کا خیال رہتا ہے، کہیں سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے

کہ وہ پاکستان کی حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں

ڈاکٹر محمد اجمل صاحب سے بھی ملا، جو دار المصنفین اور نیشنل بک فونڈیشن کے درمیان جب ہماری مطبوعات کے بارے میں معاہدہ ہوا تھا تو انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی مدد کی تھی، اسوقت وہ وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے، اب اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر ہیں، آج کل مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں،

ڈاکٹر اے۔ ڈبلو۔ ہالی پوتا صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے، میں ۱۹۷۵ء میں پاکستان آیا تھا، تو اُس وقت اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے، اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی تمام مطبوعات دار المصنفین کو نذر کی تھیں، جو اس وقت ہمارے کتب خانہ کی زینت ہیں، انھوں نے شاہ ولی اللہ پر آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی، اس موضوع پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، آج کل سندھ یونیورسٹی میں ہیں دینداری ملنساری شرافت، مروت اور محبت کے پتلے ہیں، میں ان سے مل کر پہلی بار اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے کراچی ریڈیو سے جو تقریر کی تھی، تو اس میں کہا تھا کہ ہالی پوتا صاحب جیسے سیرت اور کردار رکھنے والے لوگوں کی اکثریت پاکستان میں ہوجائے، تو یہ سرزمین سونے کی ہو جائے، ان ہی کے ساتھ ڈاکٹر محمد ابراہیم شیخ خلیل سے ملاقات ہوئی، جو تمام مجمع میں سب سے زیادہ متشرع نظر آئے انکی لمبی اور منور داڑھی اقبال کے پورے جشن میں نمایاں رہی لیاقت میڈیکل کالج حیدرآباد سندھ میں، پروفیسر تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں سندھی اور اردو کے شاعر ہیں،



سندھی میں اقبال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں، کہنے لگے کہ وہ معارف کے بہت پرانے خریدار ہیں، معارف کا یہاں آنا بند ہو گیا تو شرق اوسط کے ذریعہ منگانے لگے، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، معارف سے اس تعلق کا حال معلوم کرکے دل میں ان کی بڑی قدر ہوئی،

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری تو ازراہ کرم میرے کمرہ میں آکر ملے، کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ اچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اسلام آباد کی پیپلز یونیورسٹی Peoples university میں عربی اور اسلامیات کے پرفیسر رہ چکے ہیں، حکومت پنجاب کی علما اکیڈمی کے بانی اور ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں آج کل اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، بڑی محبت سے ملے میری کتاب بزم صوفیہ کے بڑے قدر دان ہیں، ان کا موضوع بھی تصوف ہے انگریزی کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں بعض کے نام یہ ہیں۔

Concept of God in Islam' Confession of Ghazali; Quranic Exegesis and classical tafsir اور Qusheri

میں گذشتہ مرتبہ پاکستان آیا، اور اسلام آباد میں رہا، تو بڑی خاطر کی، اس مرتبہ بھی ان کا اصرار تھا کہ میں لاہور سے اسلام آباد چلوں، اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں ایک تقریر کروں کہ دار المصنفین میں کام کس طرح ہوتا ہے، میں نے معذرت کی کہ پہلے مجھے کراچی جانا ہے، پھر اسلام آباد پہونچنے کا قصد ہے' ان ہی کے ساتھ جناب سید فضل احمد شمسی آئے ہوئے تھے، جن سے اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں

برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی، وہ وہاں فلسفہ اور سائکلوجی یونٹ کے صدر ہیں، انھوں نے انگریزی میں ایک مقالہ البیرونی پر لکھا تھا، جو بہت پسند کیا گیا ہے، جناب عبدالرحمن سورتی سے بھی ملاقات رہی، ان کے ساتھی اعظم گڈھ میں ڈاکٹر محمد معظم ہیں، اُن کا سلام پہونچا یا تو بہت خوش ہوئے، یہ مولانا محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ اسلام آباد میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، گذشتہ سفر میں بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے رہے، علمی بحث کرتے ہیں تو اپنے خیالات کو موثر انداز میں منوانے کی کوشش کرتے ہیں، قرآنی تعلیمات کو مسلمانوں کے لئے شمع راہ سمجھتے ہیں،

جناب قدرت اللہ فاطمی، (ڈائرکٹر ار ۔ سی ۔ ڈی) اسلام آباد سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، گذشتہ سفر میں اسلام آباد میں جو قیام رہا، تو انھوں نے میری میزبانی، دل داری اور دل جوئی کی ہر قسم کی کوشش کی، ان کا اصرار ہوا کہ میں اسلام آباد پہونچوں تو ان ہی کے یہاں قیام کروں،

مولانا اعجاز الحق قدوسی مصنف "شیخ عبد القدوس گنگوہی" انتہائی محبت سے ملے، صوفیائے ہند و پاکستان پر جو کام انھوں نے کیا ہے، اس کی وجہ سے پاکستان میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، تزک جہانگیری کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان کی تصنیف "اقبال کے محبوب صوفیہ" میری نظر میں بہت ہی مفید تصنیف ہے، جس سے اقبال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اب وہ اقبال اور علمائے پاک و ہند مرتب کر رہے ہیں، انھوں نے تاریخ سندھ کی دو جلدیں بھی لکھی ہیں، انکے قلم میں بڑی برق وشی ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں، قلیل عرصہ میں ایک کتاب لکھ ڈالتے ہیں کہنے لگے کہ ان میں لکھنے کا سلیقہ دار المصنفین کی مطبوعات کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے، میرے ساتھ سایہ کی طرح رہے، جس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں، ان کا مولد جالندھر اور سنہ پیدائش ۱۹۰۵ء ہے،



ڈاکٹر شبیم ول پاکستانی ہیں، لیکن اس وقت سین ڈی ای گو (San Diego) کی بین الاقوامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، وہ میری تصانیف کی وجہ سے مجھ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے ہر موقع پر بڑے مخلصانہ انداز میں ملتے رہے، کہنے لگے کہ مولانا انور شاہ، مولانا شبیر احمد اور مولانا سید سلیمان ندوی پر امریکہ میں کام کر رہے ہیں، میں نے حیات سلیمان اور معارف کے سلیمان نمبر کا ذکر کیا، تو بہت ہی اصرار کے ساتھ سو روپیے پیش کیے کہ یہ دونوں کتابیں جلد از جلد ان کے پاس بھیج دی جائیں، صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں، حج بھی کر چکے ہیں، دار المصنفین کے ساتھ اتنا اخلاص رکھتے ہیں کہ عرفات میں بھی اسے یاد رکھا، اور اس کی فلاح و ترقی کے لیے دعا کی، بڑے اچھے مقرر ہیں، جرأت مندانہ تقریر کرتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک انگریزی مضمون بھی دیا، میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس کا ترجمہ معارف میں شایع ہو جائے گا، کہنے لگے کہ امریکہ سے وہ برابر مضامین معارف کے لیے بھیجا کریں گے، جس کے لیے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میاں محمد سعید ابھی کم سن ہیں، لیکن ان کی تحریروں میں بڑی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، سیالکوٹ ان کا آبائی وطن ہے، لندن کے اسکول آف اورنٹیل اسٹیڈیز سے پی ۔ اچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اس وقت امریکہ میں جارج میسن یونیورسٹی فرفیکس میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف The Sharqi Sultanate of Jaunpur: A Political and Cultural History

بھی تھی، جس کو پڑھ کر میں بہت خوش ہوا تھا کہ ایک بڑی کمی پوری ہو گئی اور جو کام یو۔پی۔ میں ہونا چاہئے تھا، وہ لندن میں ایک پاکستانی اہل علم کے ذریعہ ہوا، ان کو جونپور کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، انھوں نے تذکرۂ مشائخ شیراز ہند جونپور بھی مرتب کیا ہے، اس کے علاوہ صحائف الطریقہ اور The Arabs in India اور Pakistan۔ کے بھی مصنف ہیں، ابھی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس کمسنی میں اب تک ۹۵ ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں، میری تمام تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، دار المصنفین کے بڑے قدر دان ہیں، وہ میرے ساتھ جس محبت اور اخلاص سے پیش آئے، اس کی یاد برابر باقی رہے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللہ اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں اسی طرح مقبول ہیں، جس طرح پاکستان میں ہیں، ان کی علمی سرگرمی کی ابتدا تو سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء اور "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" سے ہوا، لیکن اس وقت تک ۲۰ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، اقبال پر ان کی تصانیف مسائل اقبال اور مقاصد اقبال بہت مقبول ہیں، اردو میں جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام یہاں تیار ہو رہی ہے، اس کے اس وقت چیف ایڈیٹر ہیں، اب تک اس کی پندرہ جلدیں تیار ہو چکی ہیں، جن کی لکھائی چھپائی، اور جلد بندی بہت عمدہ ہے، اس سے نہ صرف ایک بڑی کمی پوری ہو رہی ہے بلکہ اردو زبان کے وزن اور وقار میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، وہ ملے تو کہنے لگے کہ میں تو مولانا سید سلیمان ندوی ہی کا پروردہ اور شاگرد ہوں، اور دار المصنفین ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں، ان کی زبان سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے استاد مرحوم اور ادارہ پر فخر محسوس ہوا،



جشن اقبال کی مشغولیتوں ہی کے درمیان ڈاکٹر صاحب نے انسائیکلو پیڈیا اف اسلام کے دفتر میں ایک تقریب منعقد کی جس میں ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس، شیدائی، اور فدائی جناب نذیر نیازی کو ایک سپاسنامہ پیش کر کے ان کی خدمت میں دس ہزار کا نذرانہ پیش کیا، ڈاکٹر سید عبد اللہ اب ثقل سماعت میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور کان میں آلہ لگائے رہتے ہیں، لیکن تقریر بڑی دلچسپ اور فاضلانہ کرتے ہیں، یہ تقریب جسٹس افضل چیمہ کی صدارت میں ہوئی، اس کے خصوصی مہمان استانبول یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر عبد القادر کاراہان تھے، جناب احمد ندیم قاسمی نے سپاسنامہ پڑھا، ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب نے ازراہ کرم مجھکو اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بڑے اصرار کے ساتھ اس تقریب میں مدعو کیا، جشن کی ہماہمی کے موقع پر ہم لوگوں کو اس تقریب میں بروقت پہونچنا بہت مشکل تھا، لیکن جناب یعقوب ہاشمی ممبر پبلک سروس کمیشن کی توجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر سید عبد اللہ کے شاگرد رہ چکے ہیں، وہ ان کے والد جناب تلوک چند محروم کے بہت قدر داں ہیں، اس موقع پر انھوں نے ان کا ذکر جس عزت او عقیدت سے کیا اور پھر خود جگن ناتھ آزاد کی تعریف و توصیف جس انداز میں کی اس سے ہم بہت متاثر ہوئے میں نے آزاد سے کہا کہ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا یہ حصہ ٹیپ کر لیتے، تو وقتاً فوقتاً اسے سن سکتے، اور ان پر مسرت لمحات کی یاد تازہ ہو جایا کرتی، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے میری علمی خدمات کا بھی ذکر کیا، اور کلمات تحسین سے نوازا، جناب نذیر نیازی صاحب نے بھی بڑی محبت کا اظہار کیا ان کی کتاب "اقبال کے حضور میں" کی ایک ضخیم جلد شائع ہو چکی ہے، جس میں نیازی صاحب نے اقبال کی جزئیات زندگی کو بڑی دیدہ دری سے

جمع کیا ہے، اس کی دو اور جلدیں تیار ہوچکی ہیں، خدا کرے وہ بھی جلد شایع ہوجائیں ان سے اقبال کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

"لکھنؤ کا دبستان شاعری" کے مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے بھی برابر ملاقاتیں رہیں، اب وہ کراچی یونیورسٹی کے امیریٹس پروفیسر تاحیات ہیں، اور پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کے اہم عہدیدار ہیں اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، لندن نیویارک، اور بنکاک میں بھی رہ چکے ہیں، ہوٹل ہی میں ان کے لڑکے اور جرمن بہو سے ملاقات ہوئی جو بہت صاف اردو بولتی تھیں، ان ہی سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری اولاد بہت اچھے عہدوں پر مامور ہے، ڈاکٹر ابواللیث نے پاکستان آنے کے بعد بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں، آج کل ڈاکٹر محمد اجمل کے ساتھ "ملفوظات اقبال" اور "اقبال اور تصوف" لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے:

خواجہ عبدالوحید سے ملنے میں بڑی خوشی ہوئی، وہ استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی کے دوستوں میں تھے، انھوں نے بتایا کہ سید صاحب لاہور آتے تو ان ہی کے ساتھ قیام کرتے، اب سے کچھ سال پہلے انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار "اسلام" نکالا کرتے تھے، اقبالیات کی ایک کتاب مرتب کی ہے، کہتے تھے کہ تبویب القرآن لکھی ہے، لیکن ابھی تک شایع نہیں ہوسکی ہے، جناب مشفق خواجہ جو اس وقت پاکستان میں اردو ادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، انھیں کے لڑکے ہیں

معارف کے بہت ہی پرانے خریدار کرنل عبدالرشید کو جب معلوم ہوا کہ میں آیا ہوں تو وہ تلاش کرتے ہوئے میرے پاس آئے وہی مجھکو خواجہ عبدالوحید کے پاس لے گئے، دہلی سے چلنے لگا تھا تو مفتی عتیق الرحمن صاحب نے کہا تھا کہ ان سے ضرور ملنا،



اور میرا اسلام پہونچا دینا، کرنل صاحب معارف میں مضمون بھی لکھا کرتے تھے، ایک زمانہ میں ہندوستان و پاکستان کے تمام اہم رسائل میں ان کے مضامین شایع ہوتے تھے، دیر تک دارالمصنفین اور معارف کے متعلق گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے کہ اب بینائی کام نہیں دیتی ہے، اس لیے لکھنا پڑھنا بند ہوگیا ہے، مگر باتیں زیادہ تر علمی کرتے رہے،

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ذکر معارف کے صفحات میں برابر آیا ہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں انھوں نے ماثر الامرا اور طبقات اکبری کے اردو ترجمے میں جو مہارت دکھائی ہے، اس سے میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، وہ ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ اپنے کسی قریبی عزیز سے مل رہا ہوں، ہر موقع پر ساتھ رہے، اور ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے۔

ڈاکٹر محمد ریاض کا مضمون اقبال پر ابھی معارف کی دو قسطوں میں شایع ہوچکا ہے، وہ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے، طہران یونیورسٹی میں تھے، اب اسلام آباد کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں واپس آگئے ہیں، اقبالیات پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں، ان پر کتابیات بھی تیار کی ہے،

ڈاکٹر صابر آفاقی مظفر آباد کے گورنمنٹ کالج میں اردو کے استاد ہیں انھوں نے راج ترنگنی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، جسے میں نے خاص طور سے ڈاکٹر علی اکبر جعفری ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے مانگ کر حاصل کیا تھا، اس لیے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، وہ برابر بڑی گرم جوشی اور حسن اخلاق سے ملتے رہے، اقبال اور کشمیر کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد میں فارسی کے

استاد ہیں، ابھی زیادہ عمر نہیں ہے، لیکن بہت سی کتابیں اردو اور فارسی میں لکھ لی ہیں، داتا گنج بخش، اردو زبان پر فارسی کے اثرات، فارسی ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، دیوان عمیدی طرانی بھی ایڈٹ کیا ہے، اقبالیات پر کتابیات بھی تیار کی ہے، علامہ محمد اقبال پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں،

ڈاکٹر محمد باقر نواب ستادوں کو استاد ہیں، اسلامیہ کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کے ساتھ اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں، لندن اور نیویارک کی یونیورسیٹوں میں جاکر پڑھایا ہے، ان کی کتاب "لاہور" میری میز کے سامنے الماری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، اس لیے ان سے بڑے شوق سے ملا، انھوں نے سا سانیوں پر بھی ایک اچھی کتاب انگریزی میں لکھی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فارسی تذکرہ مخزن الغرائب کو ایڈٹ کر رہے ہیں، اس کی دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں یہ دونوں جلدیں دار المصنفین کو بطور ہدیہ دینے کا وعدہ کیا ہے،

ادارہ ثقافت اسلامی لاہور کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد سعید سے پاکستان کے گزشتہ سفر میں اسلام آباد میں برابر ملاقات ہوئی، تجدید ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، فلسفہ پر نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، اقبال اور پاکستان فلوسفیکل جرنل کے اڈیٹر بھی رہے، پروفیسر محمد شریف نے ہسٹری آف مسلم فلوسفی جو دو جلدوں میں لکھی ہے، اس میں انھوں نے بھی بڑی مدد پہونچائی انگریزی میں ان کی کتاب اسٹڈیز ان اقبالس تھاٹ اینڈ آرٹ ہے، بڑے خلیق ملنسار اور دوست نواز ہیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات دار المصنفین کو نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے،

مولانا محمد حنیف ندوی اب پرانے ندویوں میں شمار ہوتے ہیں ہمارے مولانا عبدالسلام قدوائی اور رئیس احمد جعفری کے گہرے دوستوں میں ہیں، اپنی عربی دانی



اور خطابت میں شروع سے ہی ممتاز ہیں، ۱۹۲۶ء میں حکیم اجمل خان کی زیر صدارت ندوہ کے اجلاس کانپور میں ان کی عربی تقریر نے دھوم مچادی تھی، آج کل ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ ہیں، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے وہ جشن اقبال میں نہیں آسکے تھے، میں خاص طور پر ادارہ ثقافت اسلامیہ ان کی مزاج پرسی کے لئے گیا، میرے اس فرط تعلق سے وہ بہت مسرور ہوئے،

پروفیسر شریف المجاہد سے ملاقات جناب حسام الدین راشدی صاحب کی وساطت سے بہت پرانی ہے اس موقع پر اس کی تجدید ہوئی، مدراس اسٹین فورڈ، میک گل، اور سیراکیوز یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے، بڑے وسیع النظر ہیں، کراچی یونیورسٹی میں جرنلزم کا شعبہ قائم کیا، اس کے پروفیسر بھی رہے، امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے بھی پروفیسر رہ چکے ہیں، اس وقت کراچی میں قائد اعظم اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں، پاکستان کی طرف سے جو ہسٹری آف فریڈم موومنٹ لکھی گئی ہے، اس میں ان کے لکھے ہوئے کئی ابواب ہیں بڑی اچھی علمی اور سیاسی گفتگو کرتے ہیں

پروفیسر میجر ابوالخیر کشفی سے بھی ملاقات رہی، اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ ثاقب کانپوری کے صاحبزادے ہیں،

ڈاکٹر محمد جہانگیر خان ڈائرکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان پنجاب یونیورسٹی خود پڑھ کر جس محبت اور اخلاص سے ملے، اس کا نقش دل پر برابر قائم رہے گا، کیمبرج یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، ہیرسٹری کی بھی ڈگری ہے، پنجاب کے مختلف کالجوں کے پرنسپل رہے، مغربی پاکستان کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی تھے، جنرل ایوب کے

زمانہ میں مغربی پاکستان کی وزارت تعلیم کے مشیر اور جوائنٹ سکریٹری تھے یورپ کے ممالک کی سیاحت بھی کی ہے، اپنے زمانہ میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی بھی رہ چکے ہیں ان تمام مراتب و اعزازت کے باوجود بڑے ملنسار ہیں، ان کی گفتگو میں بڑی سنجیدگی اور متانت تھی، اپنی ریسرچ سوسائٹی کی مطبوعات میرے لیے خاص طور پر بھیجیں مگر غلطی سے دوسرے صاحب کے پاس چلی گئیں، وعدہ کیا ہے کہ وہ پھر ان مطبوعات کو دار المصنفین کی نذر کریں گے۔

ہندوستان میں اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر جو وفد گیا تھا، اس کے ارکان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان میں ڈاکٹر معز الدین اس وقت اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور کے ڈائرکٹر ہیں، وہ میرے استاد پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے داماد ہیں، اس لئے بڑی یگانگت سے ملے، پاکستان کے گذشتہ سفر میں بھی انکی عنایتوں سے بہرہ مند ہوا تھا، پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے، لندن جاکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت مقبول ہیں، اقبال اور یورپ، اقبال اور مسلم ورلڈ، اقبال اور قائد اعظم کے عنوانات سے کتابیں بھی لکھی ہیں،

ہندوستان جو وفد گیا تھا، اس کے ایک اور اہم رکن ڈاکٹر عبد الوحید قریشی تھے، جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں اسلامیات اور مشرقیات کے ڈین ہیں، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اسوقت تک ۳۰ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں اور تین سو (۳۰۰) سے زیادہ مضامین لکھے ہیں، انکا سال پیدائش ۱۹۲۵ء ہے، ان کی نوازشیں برابر ممنون کرتی رہیں۔



ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہندوستان کا علمی و ادبی حلقہ اچھی طرح واقف ہے، وہ بھی پاکستانی وفد کے ساتھ دہلی گئے تھے، اس وقت اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں، لندن اور امریکہ میں بھی وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اردو شعر و ادب میں اپنی ناقدانہ نظر کی وجہ سے بڑی عزت اور مقبولیت رکھتے ہیں، بیس کتابوں کے مصنف ہیں، اور سولہ کتابیں ایڈٹ کی ہیں، بڑے تپاک سے ملے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہوٹل میں میرے کمرے کے سامنے والے کمرہ ہی میں ٹھہرے تھے، ان کی مشہور شخصیت سے اس برصغیر میں کون واقف نہ ہوگا، عالمگیر شہرت کے مالک ہیں آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں، پاکستان میں، پشاور سندھ اور اسلام آباد یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر ہوئے، پھر امریکہ میں کولمبیا اور کسی دوسری یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر رہے، یونسکو میں بھی ان کو عہدے ملتے رہے، پاکستان کی اکیڈمی آف سائنس کی صدارت کے فرائض بھی بہت دنوں تک انجام دے چکے ہیں، پاکستان کے ہر حلقہ میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، باتوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے، اقبال کے بڑے عقیدت مند اور مداح ہیں، ان کے زمان و مکان کے فلسفہ کو اردو میں بہت اچھی طرح سے سمجھایا ہے،

ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی کو پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کے ہفت صد سالہ جشن کے موقع پر ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اس مرتبہ تجدید ملاقات ہوئی، میری تصانیف کے قدرداں ہیں، اس لئے بہت محبت سے ملے، سید صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں، سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے

تعلقات پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے، ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس تھے، کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ شروع میں ایک اسکول کے ماسٹر رہے تھے، سید صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تعمیرات، مصوری اور فنون لطیفہ کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں مجھ سے گجرات کے سلاطین کے عہد کی تمدنی تاریخ کی فرمائش کی ہے، یہ دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے ہے، میں نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے،

اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کا اس وقت برصغیر میں طوطی بولتا ہے، وہ جب کہیں ملتے بہت ہی شرافت حسن اخلاق سے پیش آتے۔

پاکستان سے باہر کے نمایندوں میں ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی سے بھی ملاقات رہی، یہ دہلی کے اقبال کے بین الاقوامی سمینار میں شریک ہوئے تھے، اور وہاں میرے مقالہ کو بہت پسند کیا تھا، وہ آذربائیجان کے رہنے والے ہیں، اس وقت ایڈنبرا یونیورسٹی میں فارسی کے استاد ہیں، بڑے جری مقرر ہیں، بڑی بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اقبال کے شیدائی ہیں، مستشرقین کو پسند نہیں کرتے، کہنے لگے کہ یہ ریاکار اور جھوٹے ہوتے ہیں، اسلام پر کتابیں اور مقالے لکھ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں

لندن کے اسکول آف اورینٹل اور امریکن اسٹیڈیز کے پروفیسر رائف رسل کی ملاقات کا بھی ذکر ہے، اردو بہت بے تکلفی سے بولتے ہیں، اس طرح گھل مل کر رہے جیسے پاکستان ہی کے ہیں، غالب پر ان کی کئی کتابیں ہیں، یہ جشن ایسا شاندار تھا کہ بلجیم کے نمایندہ نے کہا کہ ایسی شاندار کانگریس میں نے کہیں نہیں دیکھی، ڈاکٹر محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر خالد حمید شیخ، صمد ہاشمی اور ڈاکٹر ریاض الرحمن، ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری کو مہمانوں کی میزبانی میں سرگرم پایا،

(باقی)



# مطبوعات جدیدہ

الانور ۔ مرتبہ جناب عبدالرحمن صاحب کوندو تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۰۴، مجلد قیمت للعہ پتہ :۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

یہ کتاب علماے دیوبند کے سرخیل مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کی سوانح عمری ہے جو کئی حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ شاہ صاحب کے عام حالات وسوانح پر مشتمل ہے، اس میں ان کی ولادت سے وفات تک کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور اولاد وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرا حصہ متعدد مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین خود فاضل کو مرتب قلم سے ہیں، اور چند شاہ صاحب کے اعزہ اور ممتاز تلامذہ کے ہیں، جو بعض کتابوں اور رسالوں سے ماخوذ ہیں، ان میں ان کے فضل وکمال، خصوصیات درس، دینی خدمات اور رد قادیانیت وغیرہ کے علاوہ ان کے کئی نامور معاصرین سے روابط وتعلقات کا ذکر ہے، آخر میں تین تتمے ہیں، پہلے میں شاہ صاحب کے استاذ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور دوسرے میں ان کے مورث اعلیٰ شیخ بابا مسعود نروی اور چند مشہور اہل خاندان کا مختصر تذکرہ ہے، تیسرے تتمہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب نسباً سید نہ تھے، شروع میں شاہ صاحب کے عہد اور اس سے پہلے اور بعد کے کشمیر کی مختصر تاریخ بیان ہوئی ہے، شاہ صاحب کے حالات وکمالات اردو اور عربی میں بعض

کتابیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، اس نئی کتاب میں ان کے ذاتی حالات و سوانح کو زیادہ محنت دعرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے لیکن شاہ صاحب جیسی صاحب علم و کمال ہستی کی سوانحعمری کا حق انکی جدت و ابتکار، علمی افکار، فقہ و حدیث میں امتیازی کارناموں پر مبسوط تبصرہ کے بغیر پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا، غالباً مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، اس لئے جابجا حشو و زوائد اور تکرار، جملوں میں بے ترتیبی تعبیر و طرز ادا میں خامی اور زبان کی غلطیاں ہیں مثلاً "مولانا معظم شاہ کو انور شاہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں یہ فیصلہ لینے میں کوئی زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی . . . . چنانچہ ۱۳۰۵ھ میں بعمر (۱۳ سال) "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے اس عملی مصداق کو اپنے والد گرامی مولانا معظم صاحب نے ہزارہ روانہ کر دیا" (ص۱۰) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کا مدرسہ امینیہ دہلی کو زندہ رکھنے اور اسکو ترقی دینے میں قوم پر انکا احسان عظیم ہے۔" (ص۱۱۰) ایسے لوگوں کو دیوبند کے طرز پر مدرسہ قائم کرکے اس کو بیداری عامہ اور اس کے سایہ میں انقلاب حالات کی جد و جہد کا فلسفہ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا، (ص۱۱۵) اس زمانہ میں زاد سفر حج کے طور سے بہت تھوڑی رقم کافی ہو جاتی تھی، (ص۱۱۹) بارہ مولہ کا مقام وادی کے دوسرے سب مقامات سے زیادہ موزوں مقام تھا (ص۱۳) کہیں کہیں محاورے میں بھی غلطی ہو جیسے کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی (ص۱۳۳) دیکھ بھال کا املا کئی جگہ بال، اور ملاء اعلیٰ کو مونث لکھا ہے، وجوہات، لوازمات، اکابرین، عمائدین اور سرحدات بے تکلف لکھ گئے ہیں، ایک جگہ مولانا عبد الماجد دریابادی کو مولانا تھانوی کا خلیفہ لکھا ہے، وہ مولانا مدنی سے بیعت تھے، مولانا احمد رضا خان بجنوری کے مضمون میں علامہ ابن حزمؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کا ذکر نامناسب انداز میں کیا گیا ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۸ء عدد ۲

## مضامین


| | | |
|---|---|---|
| شذرات | عبد السلام قدوائی ندوی | ۸۲-۸۴ |

### مقالات

| | | |
|---|---|---|
| علامہ اقبال کا فکری ارتقاء | جناب مولانا عبد السلام خاں رامپوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور، | ۸۵-۱۰۴ |
| رصدگاہ محمد شاہی دہلی یا جنتر منتر | جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش | ۱۰۵-۱۲۰ |
| حافظ سخاوی | منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین | ۱۲۱-۱۳۵ |
| علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن | سید صباح الدین عبد الرحمن | ۱۳۶-۱۵۱ |
| ارادت خاں واضح کی ایک تصنیف کلمات | ڈاکٹر سید عبد الرحیم صدر شعبہ عربی ناگپور مہاودیالہ (ناگپور) | ۱۵۲-۱۵۵ |

### ادبیات

| | | |
|---|---|---|
| غزل | جناب بسمل شاہجہاں پوری | ۱۵۶ |
| " | جناب مقیم الدین احسن دریابادی مرحوم | " |
| مطبوعات جدیدہ | "ض" | ۱۵۷-۱۶۰ |